انتساب

ندا فاضلی نمبر

کے سالانہ جلسہ کی ایک یادگار تصویر۔ سرونج ۲۷ نومبر ۱۹۸۳ء۔ تصویر میں دائیں سے
جناب وقار فاطمی۔ جناب فضل تابش۔ لیاقت قریشی۔ شفیق سرونجی۔ محمد راشد۔ جناب ندا فاضلی
۔ انتساب کے مدیر سیفی سرونجی۔ نفیس شاداب۔ ظفر سرونجی۔ نفیس پرویز۔ دکھائی دے رہے ہیں

کتاب "رنگوں کا امتزاج" کے اجراء پر تقریر کرتے ہوئے
بروت۔ رؤف جاوید، دانش مالوی، ظفر جبائی، سیفی سرونجی

HaSnain Sialvi

انتساب

ایڈیٹر آسیہ سیفی

شمارہ نمبر ۲۲

ایک شمارہ ندا فاضلی کے نام

سیفی سرونجی

اس شمارے کے خصوصی معاونین

وقار فاطمی
شفیق جاوید
گلشن تلوانی
ڈاکٹر راجیش شری واستو
عبدالاحد ساز
سید شکیل دسنوی
سید ضیاء الدین نوشاد
شکیل گوالیاری
پروین صبا
غازی ولی احمد

معاون ایڈیٹر شفیق سیرونجی، ابراہیم اشک

مرتبین۔ سیفی سرونجی
آصف سعید

اس شمارے کی قیمت ـــــ پچاس روپیہ زرسالانہ -/35

رابطہ:- سیفی لائبریری سرونج 464228

HaSnain Sialvi

ندا فاضلی نمبر

پیغامات تاثرات اور خطوط

...یسر محمد حسن، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر عنوان چشتی
...کمال احمد صدیقی، مختار شمیم، پروفیسر ظفر امام، کمار پاشی، مخمور سعیدی
...یسر حامد جعفری، وفا ناظمی، عشرت قادری، ڈاکٹر عزیز انصاری، نامی انصاری
...ائد زار، فیاض رفعت، احمد کمال پروازی، ڈاکٹر اخلاق اثر، پروفیسر فرید پربتی
...کٹر خورشید شمع، ڈاکٹر کمار پانی پتی، اسماعیل ذبیح، ش۔ک۔ نظام، رہبر جونپوری
...ور گھپوری، غازی ولی احمد، سید ضیاء الدین نوشاد، سعید محمد اللہ دوائ
...لیم جاوید اختر، قیصر اقبال۔ ویر نرائن شرما ایڈوکیٹ، رشید انصاری، سید شکیل دسنوی
نعمان شوق، رؤف خیر، ڈاکٹر راجیش شری واستو، پرکاش چندر، امیر قزلباش
اور ڈاکٹر شاہد میر۔

HaSnain Sialvi

مضامین

ادراک

احساس

عرفان

خود نوشت

دو باتیں

ندا فاضلی اردو کے جدید شعرا میں ایک معتبر نام تسلیم کیا جاتا ہے جنھوں نے اپنی ابتدائی شاعری سے ہی پڑھے لکھے حلقے کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا ندا فاضلی نے شعر و ادب کی جس صنف کو بھی چھوا اس میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور اس صنف کو اردو ادب کی ایک اہم صنف بنا دیا چاہے وہ دوہے ہوں یا گیت ہوں یا ان کی نظمیں ہوں۔ ہر جگہ اور ہر صنف میں وہ منفرد دکھائی دیتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ گذشتہ سال شاعر میں ان کی خود نوشت دیواروں کے بیچ پڑھکر ان کی نثر کے منفرد اسلوب کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

سہ ماہی انتساب کا یہ خصوصی شمارہ ندا فاضلی کے نام کیا جا رہا ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اس خصوصی شمارے میں ندا فاضلی کے تمام کارناموں کو یکجا نہیں کر سکا۔ پھر بھی یہ شمارہ ندا فاضلی کی منفرد شخصیت اور ان کی تخلیقی کارناموں پر روشنی ضرور ڈالتا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس شمارے کیلئے ہندوستان کے تمام مشہور قلم کاروں نے اپنے قلمی تعاون سے نوازا ہے جن کا میں بے حد شکر گذار ہوں۔ کچھ اپنی مصروفیات کی وجہ سے نہیں لکھ سکے انہوں نے اپنے مفید مشوروں سے نواز کر حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ ان میں محترم گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، پروفیسر عنوان چشتی، تیج ناتھ زار، ڈاکٹر مختار شمیم، کمار پاشی، س۔ک۔ نظام، ڈاکٹر اخلاق اثر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ مجھ میں اس کام کے کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی کہ میں اتنا میٹر جمع کر لیتا مگر محترم وقار فاطمی، انور خاں، ناظر نعمان، عبدالاحد ساز اور میرے دوست شفیق سرونجی نے نہ صرف میرا حوصلہ بڑھایا بلکہ اپنے بھرپور تعاون سے نوازا۔ انہیں کی ہمت اور تعاون کا نتیجہ ہے جو آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

خدا کی ذات سے امید ہے کہ میری یہ حقیر سی کوشش کو سراہا جائیگا۔

سیفی سرونجی

ندا فاضلیؔ کے نام

سہ ماہی انتساب کے ندا فاضلی نمبر کے لئے

اے سرزمینِ شعر و ادب آفریں کہ آج
تیری فضا میں گونج رہی ہے صدا کوئی
آیا ہے تیری بزم میں بنکر "ندا" کوئی
جو بن گیا بلند نگاہی کے سر کا تاج

جس نے مزاجِ فن کو نیا پیرہن دیا
تاریخ میں ادب کے وہ اک خوش کلام ہے
ذی علم، ذی ہنر ہے بڑا نیک نام ہے
نوکِ مژہ سنوار کے اک بانکپن دیا

کانوں میں آ رہی ہے اک آواز ذی شعور
حیران ہے سب کہ کون جگاتا ہے خواب سے
ہیں محو سب چھڑا ہے وہ نغمہ رباب سے
اک موجِ انبساط ہے ہر سمت دور دور

تحسین و آفرین تجھے سہ ماہی "انتساب"
تو نے ادا کیا جو تیرا فرض عین تھا
تجھ پر ادب کا اور ندا کا یہ دین تھا
سیفی صدا آفریں یہ تری چشمِ انتخاب

جس نے روایتوں کو لباسِ جدید میں
اسلوب زیب و زینت و تزئیں عطا کیا
شعر و ادب کو پیکرِ رنگیں عطا کیا
دوری رہی نہ شرحِ قریب و بعید میں

ہم بھی اسیرِ زلفِ عقیدت ندا کے ہیں
لیتے ہیں اس کا نام بہ صد عز و احترام
ہم بھیجتے ہیں اس کے لیے تحفۂ سلام
گرویدہ ہم بھی اس دلِ درد آشنا کے ہیں

صابر آروی

ایک تعارف

شفیق سہروردی

(۱) ندا فاضلی کے بیرونی مشاعروں کی تعداد تقریباً ۵۰

ندا فاضلی کے سفر(۲) — ندا فاضلی کی کتابیں(۳)

اٹلی، امریکہ، پاکستان، ہالینڈ
روم، نیویارک، شارجہ، دبئی، قطر
شکاگو، بیٹوٹ، وغیرہ

لفظوں کا پل، ملاقاتیں، مور ناچ (اردو)
آنکھ اور خواب کے درمیان۔ مور ناچ (دیوناگری)
اور انگریزی میں(۴)

★ آنیوالی کتابیں ★

اُردو ۳ ہندی ۲ انگریزی ایک

(۵)

ندا فاضلی کے فلموں کی تعداد

بس ۲۰

آنے والے فلموں کی تعداد دس!

چند فلموں کے نام:- آپ تو ایسے نہ تھے، رضیہ سلطان، فلک، بادشاہ سویکار کیا میں نے، کنواری بہو، آہستہ آہستہ، جائداد وغیرہ۔

HaSnain Sialvi

برادرم سیفی صاحب - آداب

آپ کا خط ملا - یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ
"انتساب" کا ندا فاضلی نمبر نکال رہے ہیں
ان دنوں ایک ایسے کام میں مصروف ہوں
جو بہت اہم ہے - ندا فاضلی کی شاعری کو
میں نے ہمیشہ پسند کیا ہے ندا کی شاعری کو
تو میں پسند کرتا ہی تھا لیکن گذشتہ سال "شاعر"
میں دیواروں کے بیچ اس کی خود نوشت پڑھ کر
میں اس کی نثر کا بھی معترف ہو گیا - ایسی خوبصورت
نثر دیکھ کر تعجب میں پڑ گیا کہ ایک اچھا شاعر اچھا
نثر نگار بھی ہو سکتا ہے حالانکہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے
کہ ایک اچھا شاعر اچھی نثر نہیں لکھ سکتا اچھا نثر نگار
اچھی نظم نہیں لکھ سکتا - بہر حال یہ کلیہ تو نہیں ہے
استثناء ہر کلیہ میں موجود ہے اگر ہم تاریخ کا مطالعہ
کریں تو شاید صاحب سیف و قلم کچھ لوگ مل جائیں گے
حالانکہ ایک تلوار چلانے والا ایک اچھا صاحب قلم
نہیں ہو سکتا اسی طرح ایک صاحب قلم تلوار نہیں چلا سکتا
مجھے یقین ہے کہ آپ ندا فاضلی نمبر ندا کے شایان شان
نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے

گوپی چند نارنگ

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

ڈاکٹر محمد حسن

ندا ایک ایسے نوجوان کی آواز ہے
جو صالح اور مستحکم طور پر جینا چاہتا ہے اسے
انسانی تعلقات کی گرمی اور باہمی رشتوں
کی شناسائی عزیز ہے۔ مگر سماجی نظام نے
ایک اجنبی اور معاندانہ معاشرے میں لا ڈالا ہے
اور اسی کشمکش میں اسکی شخصیت ٹوٹ کر
بکھر کر ریزہ ریزہ ہو گئی ہے وہ صنعتی تشنج کے
ذات سے ٹکرانے اور کچل ڈالنے کے عذاب کی
شاعری ہے

محب مکرم۔ تسلیمات
آپ کا ۲۰ر دسمبر کا خط اب ملا ہے۔ کہیں
ڈاک میں پڑا رہا ویسے بھی نئے سال کی ڈاک
قسطوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ ندا فاضلی میرے
عزیز دوست ہیں۔ صرف اس وجہ سے نہیں بلکہ
اس وجہ سے کہ انہوں نے اچھی شاعری کی ان پر
ضرور لکھوں گا۔ انہوں نے نثر کا ایک مجموعہ
بیس برس ہوئے دیا تھا میرے ذخیرہ کتب
میں وہ ہے ضرور، لیکن کتابیں الماری میں بے ترتیبی
سے بند ہیں یہ مجموعہ اور شعری مجھے بھجوا دیں گھر
کے پتے پر۔

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

ڈاکٹر قمر رئیس

برادرم سیفی صاحب تسلیم
خط ملا۔ ندا صاحب کی شاعری پر لکھنا
چاہتا ہوں۔ لیکن ان دنوں بہت سی مصروفیات
میں الجھا ہوا ہوں۔ اس لئے مشکل ہے

خیر اندیش قمر رئیس

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ماہنامہ "انتساب" کا "ندا فاضلی نمبر" منظر عام پر آنیوالا ہے اور اس کو جواں سال شاعر سیفی سرونجی مرتب کر رہے ہیں میں ان کے جذبہ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ ندا فاضلی اس پائے کے شاعر ہیں کہ ان کا محاسبہ کیا جائے اور ان پر نمبر نکالا جائے۔ سیفی سرونجی انتساب کا ندا فاضلی نمبر نکال کر یقیناً ایک اہم ادبی و شعری خدمت انجام دے رہے ہیں

ندا فاضلی ایک صاحب طرز شاعر اور ادیب ہیں۔ شاعری میں انہوں نے اپنے گرد و پیش کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو چن کر اپنی شعری کہکشاں سجائی ہے اور اپنی شاعری کے موضوعات کا انتخاب کیا ہے نیز ان پر نئے انداز سے نظر ڈالی ہے اور ان کے باطن میں جھانک کر معنویت کی نئی دنیا تک رسائی کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے رسمی و روایتی شعری زبان کو خیرباد کہہ کر بول چال کی زبان اور لہجے اور رسیلے انداز بیان کو وسیلہ اظہار بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں محبت کی چمکار اپنی پوری معصومیت اور بے باکی کے ساتھ رسماتی ہے اس دور کے کوتے اور بکھرے انسان کی سائیکی بھی نظر آتی ہے—

ندا فاضلی کی نثر میں بھی ایک خاص ذائقہ اور البیلا پن ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ بلا کا ذہین اور شریر ہے۔ ندا فاضلی خود پر طنز ہی نہیں کرتا بلکہ بازار میں برہنہ ہونے کی جسارت کر لیتا ہے اس لئے کبھو کبھی دوسرے کپڑے بھی اتروا لیتا ہے جس پر لوگ منہ بناتے ہیں یہ سارا کام وہ بول چال کی زبان اور اکہرے لچک دار اور رسماتے ہوئے اسلوب میں کرتا ہے

مجھے یقین ہے کہ ندا نمبر انشاء اللہ کامیاب رہیگا

مخلص

عنوان چشتی

ندا فاضلی کی شاعری ہو یا ان کی نثر
دونوں ایک انفرادی شان لئے ہوئے ہیں
زندگی کی طرف ان کا رویہ بہت واضح ہے
اور اس رویے کی تشکیل چونکہ ان کے
نجی تجربات سے ہوئی ہے اس لئے اس میں
وضاحت کے ساتھ استقامت بھی ہے
وہ غزل اور نظم کو تو ابتدا ہی سے اپنا
وسیلۂ اظہار بنائے ہوئے ہیں۔ گذشتہ
چند برس سے دوہے بھی کہہ رہے ہیں اپنی
غزل اور نظم میں وہ ایک مادیت پرست
کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ لیکن اپنے
دوہوں میں وہ ذہنی ارتفاع کی گہری غزلوں
کی طرف بڑھتے ملیں گے۔ مجھے ایسا لگتا ہے
کہ ان منزلوں کی طرف ان کا سفر، ان پر
بصیرت کے کچھ نئے در وا کر رہا ہے اور ان کے
فکر و فن کی ارضیت میں ماورائیت کی جہت
بھی نمایاں ہونے لگی ہے جو صرف ان کی
شاعری کے لئے نہیں، ان کی شاعرانہ
اہمیت کے حوالے سے معاصر اردو شاعری
کے لئے بھی ایک مبارک شگون ہے۔"

مخمور سعیدی

آداب و تسلیمات
امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا

آج ہی پتہ چلا ہے کہ آپ عنقریب مستقبل میں
"انتساب" کی ایک خصوصی اشاعت (یعنی
ایک ضخیم شمارہ) بھائی ندا فاضلی کے نام
کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں عرض کرنا
چاہوں گا۔ کہ میں بھی ان کے مداحوں میں سے
ہوں۔ ندا فاضلی کے متعلق میرا آج بھی ایک
مقالہ زیب ترتیب ہے بہت جلد مکمل ہو جائیگا
آپ کو کب تک ارسال کر دوں۔ برائے کرم
آج ہی دو لفظ لکھ دیجئے گا۔ شکریہ

بصد خلوص و احترام
خاکسار
کمار پانی پتی

فیاض رفعت
آل انڈیا ریڈیو بمبئی

سیفی صاحب

انتساب کے تازہ شمارے میں تین صفحے سادہ ہیں سادہ صفحوں کی بھی اپنی کہانی ہوتی ہے جس کے لئے رنگ آمیزی کا جادو جگانا ضروری ہے۔ صفحۂ قرطاس میں رنگ و نور کی بارش نہ ہو تو مزہ نہیں آتا۔ آپ کے قلم کار باوقار ہیں۔ کتابت کی غلطیاں خارگزرتی ہیں پرچے کو مزید لائق اعتبار بنایئے اور انتخاب کے سلیقے کو برتیے۔

- جناب مجی رضا نے ندا کے شعر کی تشریح کی اچھا لگا۔ معصوم اور شائستہ آدمی ہیں یہ اور بات ہے انسانی سماج کی تفریق سے بھری ہوئی کیفیت اس کا دامن دل نہیں تھام سکی۔ ندا کا شعر احساس شگفتگی کے اعتبار سے یکتائے روزگار ہے۔ محاورہ بچکر نکل گیا فصیح تر ہے لیکن سیاق و سباق کے پیش نظر بچ کر گزر گیا اپنی اثر انگیزی کے اعتبار سے موزوں ترین ہے اب آیئے شعری تفہیم پر دو باتیں ہو جائیں کبھی کبھی کسی شناسا کو پھٹے حالوں دیکھ کر ہم اس سے دامن بچانے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہماری فراغت (سفید پوشی) کو دیکھ کر کہیں وہ مزید احساس کمتری کا شکار نہ ہو جائے فنکار کی حساس طبیعت اپنے ظاہری وجود اپنی ظاہری شخصیت کو مفلوک الحال شخص سے چھپا کر رکھنا چاہتی ہے کہ اس کی فراغت اس کے لئے باعث ندامت ہوئی جا رہی ہے فنکار کا یہی احساس زیاں اسے دوسروں سے ممیز کرتا ہے کہ وہ اپنی آسودہ حالی کے سحر سے آزاد ہو کر دوسروں کی زبوں حالی کو اپنی روح میں منتقل ہوتا ہوا دیکھتا ہے کہ اس کے تزکیہ نفس کے لئے یہ لازمی بھی ہے اور ضروری بھی۔

کہ یہ تلاش ہی فنکار کو درجہ امتیاز عطا کرتی ہے اپنے اپنے ذوق جمال اپنے اپنے شعور کی بات۔

اب ذرا شعر پڑھیے اور لطف اٹھایئے

رستے میں وہ ملا تھا میں بچ کر نکل گیا
اس کی پھٹی قمیض مرے ساتھ ہو گئی

شاعر کے ذہن و دل پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہے اور اپنے شخصی وجود کی منافقتوں سے آزاد ہو کر محض اور محض پھٹی قمیض کے ساتھ اپنے

- بقیہ صفحہ ۹۹ پر

ڈاکٹر مختار شمیم

اندور

ہم عصر شاعری میں شہریار، زبیر رضوی، محمور سعیدی اور ندا فاضلی کی آوازیں اپنا اعتبار پا چکی ہیں۔ ندا فاضلی اپنے معاصرین میں اپنی پہچان الگ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ ارضیات سے ان کا مضبوط رشتہ ہے انکی نظموں، غزلوں، گیتوں اور دوہوں میں ہندوستانی کلچر کے رنگ لہراتے ہیں شہروں کی مشینوں کی آوازوں میں ندا نے قصبوں اور دیہاتوں کی خوشبو اور مٹھاس کی آمیزش کی ہے تپتی دوپہری مسافر زندگی کو گھنی املی کے درخت کے گھنے سایہ کا تصور ہی اسے رومانی بناتا ہے اور زندگی کو خوبصورت لمحوں کا احساس دلاتا ہے

تند سیمابی مزاج، بے قرار، اور بے چین طبیعت، طلب اور حسن طلب کی عادت ندا کی بے پناہ ذہانت کا ہی روپ ہے اور یہی روپ ندا فاضلی کی شاعری کے نکھار کا آئینہ دار ہے

میں ندا فاضلی کی نثر نگاری کا بھی قائل ہوں جملوں میں ایک طرح کی کاٹ اور الفاظ کی تراش ان کے بیان کو جہاں معصوم بچے کی مسکراہٹ بخشتی ہے وہیں کہیں نشکاری کی صید افگنی کا فخر و امتنان بن کر بے اختیار تڑپاتی ہے۔

برادرم سیفی سرونجی صاحب آداب۔

ندا فاضلی ان شعراء میں سے ہیں جو اپنی روش الگ تو ضرور بناتے ہیں لیکن روایت کا بھی احترام رکھتے ہیں اور یہ مشکل کام بہت سلیس اور عام فہم زبان میں سرانجام دیتے ہیں

آپ کا مخلص

پرکاش چندر

آہ سہیل صدیقی

بھوپال کے نوجوان شاعر ادیب سہیل صدیقی ۲۳ مارچ سنہ ۹۲ کو اچانک ایک قاتلانہ حملہ میں انتقال فرما گئے۔ انا اللہ الخ

ادارہ اس غم میں برابر کا شریک ہے

ڈاکٹر شاہد میر

ندا فاضلی

نئی اردو شاعری کا ذکر کرتے ہوئے
جن شعراء کی مثال دی جاتی ہے اُن میں ندا
فاضلی کا نام سرِ فہرست آنے والے چند ناموں
میں رکھا جاتا ہے اور یہ حق بہ جانب بھی ہے
اس کی وجہ یہ ہے کہ ندا نے جس خلاقانہ
بصیرت اور اجتہادی جسارت کا ثبوت
دیا ہے وہ اُن کے ہم عصروں میں اتنے بھرپور
انداز میں نظر نہیں آتی !

ترقی پسندوں کے یہاں عوام اور عوام
کے دکھ درد کی بات اچھالی گئی ہے مگر اُن
شعراء کے یہاں زبان اتنے ثقیل اور
بوجھل پیرائے میں استعمال ہوئی ہے کہ عوام
تو کیا خواص بھی ایک خاص ذہن و تربیت کے
بعد ہی مذکورہ شعراء سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں
دراصل اس دور کے صوفی صدی عوامی شعر
ندا فاضلی میں جو اپنی زبان اور اظہار کے ذریعہ
ان ... وسائل میں بھی ...

پیدا کر دیتے ہیں جو اردو کے عام قاری کی فہم
سے بالاتر سمجھے جاتے ہیں! رحیم، کبیر اور
میرا بائی نے شاعری کی جس دیہی تہذیب
FOLK-CULTURE کی پرورش کی
تھی۔ بلاشبہ اس کو ندا فاضلی نے اپنے گیتوں
اور دوہوں میں بہت سنبھال کر رکھا ہے!

تعارف
باسیفی

ڈاکٹر عزیز انصاری
حبیبیہ کالج ...

ڈیئر سیفی صاحب
یہ سن کر بے حد مسرت ہوئی کہ آپ ندا ... نمبر
نکال رہے ہیں۔ سفرنامہ جیسی چھوٹی سی ... دیکھتے
ہوئے آپ کی یہ بڑی خدمت قابلِ مبارکباد ہے۔
میری جانب سے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔
صوبہ سے تعلق رکھنے والے اچھے شاعر ...
اہمیت اور ادبی خدمات سے کبھی بھی ...
نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ ...
کو منتخب کیا
امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔
فقط
عزیز الرحمٰن

بقیہ

آپ کو سنگر ڈیزائن کر رہا ہے اور بھی قمیص ہی کی
پہچان ہے اس کی شناخت ہے
سیفی پھر بھی آپ کا فیاض رفعت

اردو کے نہایت ذہین وطباع اور شعر و سخن کے
اقداری اور جمالیاتی نظام کو
نظم و غزل میں تخلیقیت کیش رویوں کے ساتھ برتنے
والے شاعر

عبدالاحد ساز

کی پہلی شعری تصنیف

خموشی بول اٹھی ہے

جو اُن کی بست سالہ فکری کاوشوں کا نچوڑ ہے
دسمبر ۹۰ء کے اواخر میں منظر عام پر
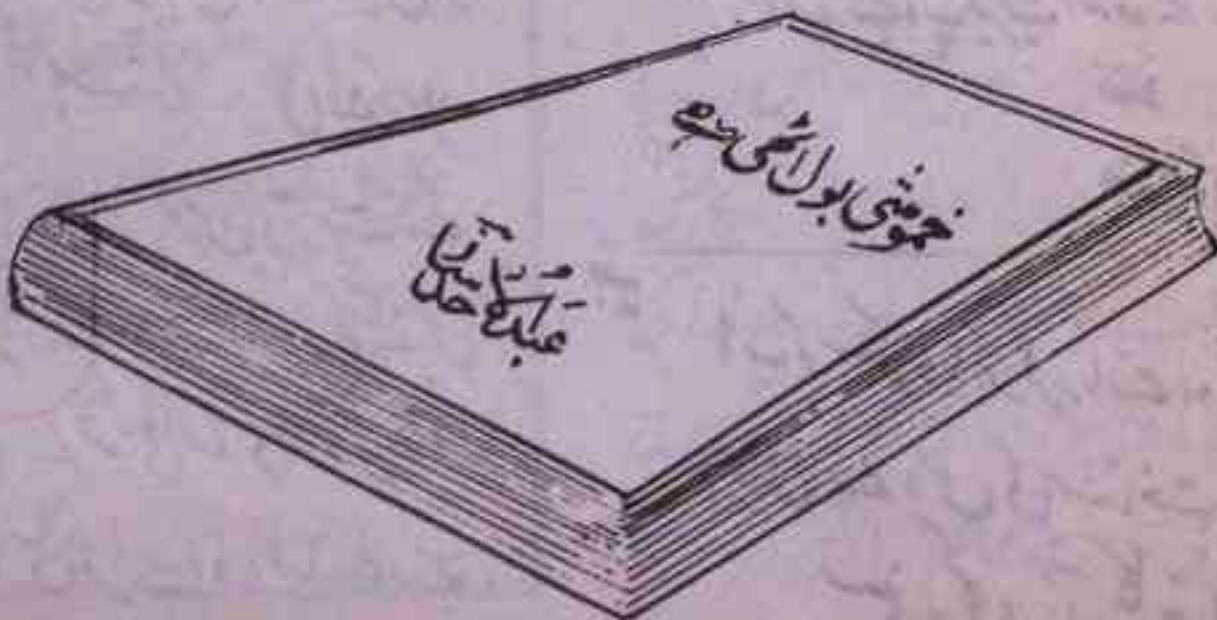
زیر اہتمام پبلیکیشنز باپو کھوٹے اسٹریٹ بمبئی - ۴۰۰۰۰۳

HaSnain Sialvi

آنکھ اور خواب کے درمیان

فضیل جعفری

۱۹۶۵ء کے آس پاس جو دو ڈھائی درجن شاعر سامنے آئے تھے۔ اور جدید شاعری کی شناخت بنے تھے۔ اُن میں سے بمشکل آدھے درجن ایسے شاعر بچے ہیں۔ جو آج بھی ذہنی اور عملی طور پر فعال نظر آتے ہیں۔ ندا فاضلی انہی گنے چنے چند شاعروں میں سے ایک ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان چند شعرا میں بھی وہ تخلیقی توانائی اور تخلیقی قوت نہیں رہ گئی جو ۱۹۶۹ء تک دکھائی دیتی تھی۔ لیکن چوں کہ ان کے بعد ابھی تک ان سے زیادہ طاقتور شاعر سامنے نہیں آئے اس لئے ان کی شاعری ہی خاصی غنیمت نظر آتی ہے۔

آنکھ اور خواب کے درمیان

ندا کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے جسے مکتبہ جامعہ دہلی کے ذیلی ادارے "مکتبہ نئی آواز" نے شائع کیا ہے انکا پہلا مجموعہ "لفظوں کا پل" اور دوسرا "مور ناچ" تھا۔ پہلے مجموعے کی اشاعت سے قبل ہی ندا کو ان کے موضوعات اور موضوعات سے زیادہ ان کے دلکش اسلوب اور اُن کی لفظیات میں پائی جانیوالی دلکش ندرت کی وجہ سے ایک اہم جدید شاعر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ گذشتہ دو دہائیوں یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ میں اس شعری اہمیت میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوا۔ تو کوئی خاص کمی بھی نہیں آئی دراصل ندا فاضلی نے شروع سے ہی اپنے لئے کسی شاہراہ کا نہ سہی لیکن ایک پگڈنڈی کا انتخاب ضرور کر لیا تھا۔ اور اس پر وہ آج تک استقلال سے قائم ہیں۔

ندا نے اپنے پہلے مجموعے یعنی لفظوں کا پل میں ایک مختصر سا غیر رسمی دیباچہ لکھتے ہوئے اپنے بارے میں بتلایا تھا۔

۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ میں بھوپال سے گوالیار واپس آیا تھا...... رات کا وقت تھا... میں گلی میں گھستے ہوئے تو اپنے آپ کو دیکھا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے تک بھی میں اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا لیکن اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا۔ اچھی ہاتھ میں

نے جو سر جھکائے واپس آیا تھا وہ میں نہیں تھا کوئی اور
تھا، مجھ جیسا ہی۔۔۔۔۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔

آنکھ اور خواب کے درمیان کی آخری
نظم میں جس کا عنوان دور کا ستارہ ہے اور
جو ہیئت کے اعتبار سے نثری نظم ہے۔ ندا نے
اپنے مندرجہ بالا بیان کو شعری اور استعاراتی
پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس نظم کا پہلا بند
ملاحظہ ہو۔

میں برسوں بعد
اپنے گھر کو تلاش کرتا رہا
اپنے گھر پہنچا
لیکن میرے گھر میں
اب میرا گھر کہیں نہیں تھا۔۔۔۔۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ عرض کر دوں
کہ ندا فاضلی نثر کو نظم میں بدل دینے پر ہی قادر
نہیں۔ بلکہ وہ اکثر اپنے شعری اظہار میں بھی حسب
ضرورت یا پھر حسب خواہش تبدیلیاں کرتے رہتے
ہیں۔ مثال کے طور پر مورناچ میں ان کی جو
نظم کھیل کے عنوان سے شامل ہے وہ آنکھ
اور خواب کے درمیان کھلونے بن گئی۔ اس طرح
مذکورہ نظم میں پہلے Version کے مقابلے
میں کہیں کوئی لفظ بدل گیا ہے تو کہیں ایک مصرعے
کو چار مختلف مصرعوں میں بانٹ دیا گیا ہے وغیرہ
ان چیزوں کا تعلق تکنیک سے ہے اس سے قطع نظر
ندا کو پھیلے ہوئے اور بکھرے ہوئے خیالات کو
سمیٹنے اور انہیں ارتکاز عطا کر دینے پر بھی زبردست
ملکہ حاصل ہے۔

مورناچ میں ان کی ایک نظم ہے جس کا
عنوان ہے "راستے کی منطق" ۲۱ مصرعوں پر مشتمل
یہ نظم بجائے خود خاصی کامیاب اور مؤثر نظم ہے
لیکن ندا نے اپنے تیسرے یعنی زیر تبصرہ مجموعے میں پوری
نظم کو بڑی خوبصورتی سے ایک شعر میں یوں منتقل کر دیا ہے

زاویۂ نگاہ

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

ندا کے بالکل اچانک اور قطعاً غیر متوقع
طور پر تنہا ہو جانے کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اس طرح
حادثہ شاید کچھ اور لوگوں کے ساتھ بھی پیش آیا ہو
لیکن تنہائی اور اکیلے پن کا احساس قصباتی زندگی
سے شہری زندگی کی طرف۔۔۔۔ سفر اور دل و دماغ

پر اس سفر کے پڑنے والے اثرات کی جھلکیاں اور پرچھائیاں ایک مستقل شعری قدر کی حیثیت رکھتی ہیں یہاں یہ وضاحت بھی کردوں کہ زندگی کو دیکھنے پرکھنے اور برتنے کے تعلق سے ندؔا کا زاویہ نگاہ جامد نہ ہو کر ارتقائی ہے۔ مثال کے طور پر لفظوں کا پل میں شامل اپنی مشہور نظم "بمبئی" میں (جسے وہ مشاعروں میں مہانگری کے نام سے بھی سناتے ہیں) بڑی حیرت اور بیچارگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا۔

یہ کیسی بستی ہے
میں کس طرف چلا آیا
فضا میں گونج رہی ہیں ہزاروں آوازیں
سلگ رہی ہیں ہوا میں ان گنت سانسیں
جدھر بھی دیکھو۔
کھوے، کولھے، پنڈلیاں، ٹانگیں
مگر کہیں چہرہ نظر نہیں آتا

جہاں تک بڑے صنعتی شہروں کا تعلق ہے انکی بے چہرگی، افراتفری اور خرد دشمنی نہ صرف جوں کی توں قائم ہے۔ بلکہ دن بدن بڑھتی جارہی ہے لیکن جہاں تک شاعر کے شعری شعور کا تعلق ہے اس نے یقین، پختگی کی منزلیں طے کی ہیں۔ غزلوں کے بعض اشعار کے علاوہ فاصلہ، اور سمجھوتہ۔ جیسی نظمیں انہی منازل کی نشاندہی کرتی ہیں۔

اس مسئلے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ شہری زندگی کے مصائب جسمانی و ذہنی تکالیف اور غیر معمولی دباؤ (tension) سے ذہنی طور پر چھٹکارہ حاصل کرنے کی غرض سے وہ بار بار اپنے بچپن اور اس سے وابستہ گاؤں کی طرف لوٹتے ہیں۔ ندؔا فاضلی دیہاتی اور قصباتی زندگی کی معصومیت اور بے فکری کے مقابلہ میں شہری زندگی کے تناؤ اور تفاوت کو محض پیش کرنے پر ہی قادر نہیں بلکہ قصباتی زندگی اور اس سے وابستہ یادیں ان کے لئے ایک ایسے نرم گاہ تکیے کا بھی کام کرتی ہیں جس کے ٹیک لگا کر وہ ذہنی تھکن اور اعصابی اضمحلال کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آنکھ اور خواب کے درمیان میں اس رویے کی (جسے میں دو ثقافتی بستی رفتی کہنا مناسب سمجھتا ہوں) مختلف مثالیں جابجا بکھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ سردست ایک مثال پیش خدمت ہے۔

لچکتی ڈال پہ کھلتا ہوا گلاب کا پھول
بہن کی شوخ ہنسی

ماں کے پیار کا درپن
جھلکتی یادوں کا بھیگا ہوا گیلا پن
لچکتی ڈالی پر کھلتا ہوا گلاب کا پھول
ہر ایک ذہن میں نقشہ بدلتا رہتا ہے
شبیہ ایک ہے پردہ بدلتا رہتا ہے
(گلاب کا پھول)

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ندا کے یہاں شعری ڈرامائیت کا وہ پہلو جس کا تعلق نوسٹلجیا سے ہے بڑی خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ اجاگر ہوا ہے۔ کبھی وہ کسی خاص سرد اور شاداب لہجے کو اپنے شعری گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں تو کبھی کسی کربناک داخلی احساس کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ کہیں اپنی بھولی بسری جڑوں کو از سر نو دریافت کرتے ہیں۔ تو کہیں کھوئے ہوئے مقامات اور لوگوں کی تلاش کرتے ہیں۔ لیکن اس رویے کو ان کی تنہا اہم خصوصیت نہیں کہا جا سکتا

ایک زمانہ میں جنسی معاملات کے تعلق سے لذت آمیز اشارے بھی ندا کی اہم خصوصیت سمجھے جاتے تھے زیر نظر مجموعے میں وہ اس منزل کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ اس مجموعے میں وہ سہیلیاں قسم کی نظمیں نہیں ملتیں۔ اگر اس قبیل کی کوئی ایک آدھ نظم دوبارہ شائع بھی کی گئی ہے تو اس کا مطلب صرف اتنا نکلتا ہے۔ کہ ندا اب ان مسائل سے محض جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔ ذہنی اعتبار وہ بہت آگے بڑھ چکے ہیں اور یہی آنکھ اور خواب کے درمیان کی اہم خصوصیت ہے۔

یوں تو اس مجموعے کی بھی بیشتر نظموں کا مرکزی کردار خود ندا کی اپنی ذات ہے۔ لیکن ان نظموں میں ان کی شعری دلچسپیاں واضح پر وسیع ہو گئی ہیں ذاتی اور داخلی تجربات والی نظموں کا تناظر بھی بڑی حد تک بدل گیا ہے۔ مثال کے طور پر نئے گھر کی پہلی نظم ایک خط جسم کی جستجو انتظار وغیرہ ذاتی وغیرہ ہونے کے باوجود ہمیں عام انسانی زندگی کی آرائشوں اور آلائشوں سے بھی واقف کراتی ہے آنکھ اور خواب کے درمیان میں یوں کئی نظمیں پڑھنے والے کو بے حد متاثر کرتی ہیں۔ لیکن انتقام "خدا کا گھر نہیں کوئی" اور والد کی وفات پر خصوصی ذکر کی متقاضی ہیں۔ اول الذکر دونوں نظموں کا تعلق خداوند کریم کی ذات بابرکات سے ہے پہلے ندا کی ایک ابتدائی نظم کے آخری دو مصرعے

پڑھ لیجئے جو یوں ہے۔

خدا خاموش ہے تم آؤ تو تخلیق دنیا ہو
تنہا سارے کاموں کو اکیلا کر نہیں سکتا

اس سلسلے میں ندا کے شعری رویے میں واضح تبدیلی آئی ہے۔ آنکھ اور خواب کے درمیاں کی غزلوں کے کئی اشعار اور متذکرہ بالا نظموں میں خداوند کریم اور حیات سے اس کے تعلق کے بارے میں۔ اُن کا رویہ خاصا صوفیانہ ہو گیا ہے۔ مثلاً اُن کی غزل کا یہ شعر

کرم اور قہار

سجدوں میں سجدوں کی شکلیں ہوئیں روشن
بے چراغ گلیوں میں کھیلتا خدا دیکھوں

یا پھر اُن کی نظم انتقام جس میں انہوں نے اپنی مخصوص لفظیات کی مدد سے شدت تاثر پیدا کرتے ہوئے بتایا ہے کہ خدا کریم بھی ہے اور قہار بھی اگر موجودہ دور کے انسان کے حصے میں کرم کی بہ نسبت قہر زیادہ آیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ

ہمارا عہد ماں کے پیٹ سے اندھا ہے
بہرا ہے ہمارے آگے پیچھے موت کا پہرا ہے

والد کی وفات پر ندا کی چند ناقابل فراموش نظموں میں سے ہے۔ اسی موضوع پر عادل منصوری اور قاضی سلیم کی نظموں کی طرح یہ نظم بھی جذبات کے خلوص اور شدت سے مملو ہے۔ ندا نے نظم کو ان مصرعوں پر ختم کر کے کہ

تمہاری قبر پر جس نے تمہارا نام لکھا ہے وہ جھوٹا ہے
تمہاری قبر میں، میں دفن ہوں تم مجھ میں زندہ ہو
کبھی فرصت ملے تو فاتحہ پڑھنے چلے آنا۔

ماضی کو حال کے تسلسل سے ہمکنار کر دیا ہے

نظموں کے علاوہ آنکھ اور خواب کے درمیاں میں متعدد غزلیں، گیت اور نثری نظمیں بھی شامل ہیں ندا کے گیتوں میں بھی اُن کی نظموں کی طرح ہی معمولی اور سامنے کے الفاظ کا غیر معمولی اور انوکھا استعمال آواز کی موسیقی سے غنائی تاثیر میں اضافہ کرنے کی کوشش ذاتی اور معاشرتی دونوں طرح کے تجربات کو معنوی اور مکالماتی انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ جیسی خصوصیات ملتی ہیں۔ ندا بطور عادت کبھی بھی مبہم اور پیچیدہ استعارے استعمال نہیں کرتے۔ لیکن جس طرح وہ بہت ہی عام اور سیدھی سادی اشیاء مثلاً گلی پھول جنگل یا آٹا نمک چاول وغیرہ کو استعاراتی شان عطا کر دیتے ہیں وہ ان کی شعری اسلوب کی ایک منفرد خوبی ہے

زیرِ تبصرہ مجموعے سب سے بڑی کمزوری اس کی غزلیں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کو بعض غزلوں کے بعض اشعار بہت اچھے ہیں۔ لیکن بیشتر غزلوں کے بیشتر اشعار انسپریشن (inspiration) سے زیادہ مشقِ سخن کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔

کچھ طبیعت ہی ملی تھی ایسی چین سے جینے کی صورت نہ ہوئی
جس کو چاہا اسے اپنا نہ سکے جو ملا اس سے محبت نہ ہوئی

ایک سے مل کے سب سے مل لیجے
آج ہر شخص ہے نقابوں میں

.... جیسے اشعار قاری کو نہ صرف مایوس بلکہ ناراض بھی کرتے ہیں۔ ان پر نہ تو ندا کی اپنی لفظیات کی چھاپ ہے۔ نہ ان کے آہنگ کی اور نہ ہی ان کے اپنے تجربات و خیالات کی۔ مجھے امید ہے کہ ندا غزلوں کی طرف آئندہ زیادہ سے زیادہ توجہ دیں گے۔

بحیثیت مجموعی "آنکھ اور خواب کے درمیان" جدید شاعری کی ایک اہم کتاب ہے۔ ○

اقبال اور اقبالیات کے موضوع پر
پروفیسر جگن ناتھ آزاد
کی تصنیفات اور تالیفات

اقبال اور اس کا عہد	۴۰ روپے
اقبال اور مغربی مفکرین	۱۰۰ روپے
اقبال اور کشمیر	۷۰ روپے
اقبال اور اس کی سوانح حیات	۵۰ روپے
اقبال زندگی شخصیت اور شاعری	۴۰ روپے
اقبال کی کہانی	۲۵۰ روپے
بچوں کا اقبال	۱۰۰ روپے
ہندوستان میں اقبالیات	۵۰ روپے

ملنے کا پتہ
انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر
۲۱۲ راؤز ایوینیو نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ڈاکٹر مختار شمیم کا

ایک اہم تحقیقی مقالہ

ظہیر دہلوی

ناشر نصرت پبلشرز لکھنؤ (یو پی)

قیمت ۱۰۰/- روپیے

ملنے کے پتے

(۱) سیفی لائبریری سرونج (ایم۔ پی)
(۲) بھوپال بک ہاؤس بدھوارہ بھوپال

مشتاق مومن

لفظوں کا پل، مور ناچ آنکھ اور خواب کے درمیاں
ایک نامتمام جائزہ

ابراہیم نذیر کے نام
جس کے احسانات نے ندا فاضلی کو
دوستی کا شعور دیا

> "... زبان شاعر کے لیے بند ڈبے کا گوشت نہیں بلکہ خون میں نہایا ہوا شکار ہے جسے دیکھ کر، چکھ کر، سونگھ کر شاعر کے پانچوں حواس جاگ اٹھتے ہیں زبان ایک نٹ کھٹ اور ضدی میڈیم ہے اسے رام کرنے میں شاعر کا سحر اس کی وحشت کھونے میں اس کا اعجاز رہا ہے اسی لئے زبان کے رخسار سیمیں پر شاعر کے بوسوں کے نشانات ہی نہیں بلکہ ناخنوں کی خراشیں بھی ہوتی ہیں۔"

جب بھی ندا فاضلی سے رسالوں اور کتابوں کے صفحات پر ملاقات ہو وارث علوی کے محولہ بالا جملے ضرور یاد آتے ہیں۔ اور ایسا گمان ہوتا ہے کہ ناقد نے شاعر کا سحر، اعجاز زبان کے رخسار سیمیں پر شاعر کے بوسوں کے نشانات اور ناخنوں کی خراشیں جیسی تراکیب ندا فاضلی کی شاعری کیلئے ہی کہی ہیں۔

ندا فاضلی کا پہلا شعری مجموعہ لفظوں کا پل نیو رائٹرس پبلی کیشنز نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا تھا کتاب کے اولین صفحات پر ندا فاضلی نے کہا تھا "۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ میں بھوپال سے گوالیار واپس آیا تھا رات کا وقت تھا میں حسب معمول اٹیچی ہاتھ میں لیے۔ اس برسوں کی جانی پہچانی گلی میں مڑ گیا۔ جہاں املی کی گھنی چھاؤں تلے میرا گھر تھا میں نے گلی میں گھستے ہوئے تو اپنے آپ کو دیکھا تھا۔ دروازہ کھٹ کھٹانے تک بھی میں اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا لیکن اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا اٹیچی ہاتھ میں لئے جو سر جھکائے واپس آیا تھا وہ میں نہیں تھا۔ کوئی اور تھا مجھ جیسا ہی ...... وہ بالکل اکیلا تھا اس کا نہ کوئی گھر تھا نہ شہر تھا اور نہ رشتہ دار تھے کاغذ پر نہ جانے لکیریں کب بدلی تھیں لیکن بٹی ہوئی سرحدیں اس پوری رات بجلی کے ایک کھمبے سے کھمبے شہر کے ہر گھر کو آگ لگاتی پھر رہی

تھیں۔ وہ اکیلا آدمی آج بھی اسی طرح اکیلا اکیلا
بھٹک رہا ہے رات کے بھیانک اندھیرے نہیں
جس گھر کو ، اس سے چھین لیا گیا تھا
اسے وہ آج تک ڈھونڈ رہا ہے یہ بے منزل
کی تلاش ہی اس کی منزل ہے ۔"
ندا فاضلی کے یہ الفاظ معمولی نہیں سرکش
نہیں۔ ان الفاظ میں میرؔ کا دل دھڑکتا ہے

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

اس انسان کا دل دھڑکتا ہے جو اپنے
ماحول، تہذیب، گھر، رشتہ دار اور قصبہ کی
باتیں کر رہا ہے ۔ یاد کر رہا ہے ان بیتے دنوں
کو جو کتنے اچھے تھے
۱۹۶۹ء لفظوں کا پل سے ۱۹۸۶ء تک
مور ناچ اور آنکھ اور خواب کے درمیان شاعر
کی زندگی جہد و جہد ٹوٹنا اور ٹوٹ کر پھر جڑنا
لمحہ لمحہ زندگی، پل دو پل کی موت، ماہ و سال
کی بھٹی میں سلگتا ہوا بے چین دل، چھبورے
کلا نگر باندرہ، نور محمدی ہوٹل کے تیز لال مرچ
کا سالن اور ڈان پاڑہ میں سجی سجائی دوکان
اور خوبصورت فلیٹ ۔

میری غربت کو شرافت کا ابھی نام نہ دے
وقت بدلا تو تیری رائے بدل جائیگی

ندا نے اب تک کی زندگی میں کیا کھویا کیا
پایا۔ اس کا عکس۔ ان کے تینوں شعری مجموعے
میں جھل مل کرتا دکھائی دیتا ہے ۔ ہماری تشنگی
بھی ہو جاتی ہے ۔ کہ اپنے خیالات، جذبات
تاثرات و تعصبات اور اپنے آدرشوں کے
اظہار کے لئے اس نے شاعری کو میڈیم کیوں
بنایا۔ شاعروں کی بھیڑ میں اس نے اپنی الگ
مضارع کیوں بنائی؟ اس کی کوئی شناخت
ہے بھی یا نہیں ۔
کیا ندا فاضلی کو چھینا ہوا گھر چھینی ہوئی
تاریخ اور تہذیب، دوست و احباب اور رشتہ دار
ماں باپ، بھائی بہن مل گئے؟
اس کا پورا جواب ہمیں ان کی شاعری میں
شاید ہی مل سکے کیوں کہ ان کی شاعری تاثرات
و تعصبات کا زیر اکس ہیں۔ آدرش نہیں جو کچھ وہ
کہنا چاہتے ہیں۔ جس سکھ اور دکھ میں ہمیں وہ
شامل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے اظہار کے لئے کیا

انھیں الفاظ مل گئے، جو کچھ ان کے دل و دماغ میں
تھا کیا سب وہ صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو سکا؟

شاید ہاں
شاید نہیں
بہت پہلے میر انیس نے اپنی قادر الکلامی
کا دعویٰ یوں کیا تھا ؎
تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں
قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرے کی چمک مہرِ منور سے ملا دوں
خاروں کو نزاکت میں گل تر سے ملا دوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں
ندا نے کوئی دعویٰ تو نہیں کیا مگر ہمیشہ
زندگی جینے کا مدعی ضرور رہا ہے۔
جیون جینا سہل نہ جانو بہت بڑی فنکاری ہے
تو چلئے ندا فاضلی سے ملاقاتیں کرنے سے پہلے
ان کے گھر جاتے ہیں۔
جب بھی گھر سے باہر جاؤ
تو کوشش کرو جلدی لوٹ آؤ
جو کتنے دن گھر سے غائب رہ کر
واپس آتا ہے
وہ زندگی بھر پچھتاتا ہے
گھر اپنی جگہ چھوڑ کر چلا جاتا ہے
(مور ناچ کی پہلی نظم)

تم جہاں بھی رہو
اسے گھر کی طرح سجاتے رہو۔
گلدان میں پھول لگاتے رہو
دیواروں پر رنگ چڑھاتے رہو
سجے بنے گھر میں ہاتھ پاؤں اُگ آتے ہیں
پھر تم کہیں بھی جاؤ
بھلے ہی اپنے آپ کو بھول جاؤ
تمہارا گھر
تمہیں ڈھونڈ کر واپس لے آئے گا

لگاؤ

دیکھتے دیکھتے
ٹی۔ وی۔ فرج
صوفہ بن کے
آدمی کھو گیا۔ عزت کا تماشا بن کے
ہر گھڑی بھاگتے رہنا ہے
مقدر اس کا

گھر کی دیواروں نے ہی چھین لیا گھر اس کا

دور کا ستارہ

میں برسوں بعد
اپنے گھر کو تلاش کرتا ہوا
اپنے گھر پہونچا
لیکن میرے گھر میں
اب میرا گھر نہیں تھا

.....

مجھے کافی دیر ہو گئی تھی
دیر ہو جانے پر
ہر کھویا ہوا گھر
آسمان کا ستارہ بن جاتا ہے
جو دور سے بلاتا ہے
لیکن پاس نہیں آتا

غزلوں سے اشعار

نہ جانے کون سے لمحے کی بد دعا ہے یہ
قریب گھر کے رہوں اور گھر نہ جاؤں میں

گھر سے چلے تھے پوچھنے موسم کا حال چال
جھونکے ہوا کے بالوں میں چاندی پرو گئے

چاند میں کیسے قید ہوئی کسی گھر کی خوشی
یہ کہانی کسی مسجد کی اذاں سے سنئے

ڈی ونچی نے یہ بات کس قدر پتے کی کہی ہے کہ ہمارے تجربات نہیں ہمارے فیصلے جھوٹے ہوا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ فیصلہ اسی وقت جھوٹا ہوگا جب کہ ہم محسوسات کو شریک عقل نہ کریں ڈی ونچی کی یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ آرٹ کی بنیاد تجربات و محسوسات پر ہے۔ نہ کہ منقولات اور معقولات پر۔ ندا کے یہاں خیال اور سوچ کی کوئی ایک لہر نہیں ہے۔ جس پر انگلی رکھ کر کہہ سکیں۔ یہی خالص اور [illegible] رنگ ہے اُن کا کسی خیال اور احساس کو وہ بیان کرتے ہیں اور پھر اسے رد کرنے میں کوئی رعایت نہیں کرتے اور پھر نیا تجربہ کرتے ہیں

میں نہیں سمجھ پایا آج تک اس الجھن کو
جسم کی حرارت تھی یا تری محبت تھی
قیس ہو کہ لیلیٰ ہو ہیر ہو کہ رانجھا ہو
بات صرف اتنی ہے آدمی کو فرصت تھی

(لفظوں کا پل سے)

..... کچھ دن خطوں میں آنسوؤں سے شور و غل ہو
تم زہر پی کے سوئیں

میں انجن سے کٹ گیا

پھر یوں ہوا کہ دھوپ کھلی ابر چھٹ گیا

میں نے وطن سے کوسوں پرے گھر بسا لیا

تم نے پڑوس میں نیا بھائی بنا لیا

....

(پھر یوں ہوا)

ایک خط :-

تمہارے نام کی خوشبو سے جب موسم سنورتے ہیں

فرشتے جب تمہارے رات دن گنا کرتے ہیں

تمہیں پانے کی حسرت تھی۔

مجھے تم سے محبت تھی۔

تمہارے خواب جب آکاش کے تاروں میں روشن تھے

گلابی انگھڑیوں میں دھوپ تھی آنچل میں ساون تھے

بہت سوں کو رقابت

مجھے تم سے محبت تھی

تمہارا خط ملا

میں یاد ہوں تم کو عنایت ہے

بدلتے وقت کی لیکن ہر اک دل پر حکومت ہے

وہ پہلے کی حقیقت تھی۔

مجھے تم سے محبت تھی

وہ لڑکی

...... وہ لڑکی یاد آتی ہے

جو ہونٹوں سے نہیں پورے بدن سے بات کرتی تھی

سمٹتے وقت بھی چاروں دشاؤں میں بکھرتی تھی

شکایت

کبھی دور تک

گرد ہی گرد ہو گی

فقط ایک تم ہی نہیں ہو

یہاں جو بھی اپنی طرح سوچتا ہے

زمانے کی نیرنگیوں سے خفا ہے

ہر ایک زندگی اک نیا تجربہ ہے

مگر جب تلک یہ شکایت ہے زندہ

یہ سمجھو زمیں پر محبت ہے زندہ

نظم ایک لڑکی ان مصرعوں پر ختم ہوئی ہے

یہ ساری چیزیں کہ جیسے مجھی میں شامل ہیں

مرے غموں میں مری ہر خوشی میں شامل ہیں

میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی یوں ہی گزرتی رہے

ادا و ناز سے لڑکے کو پیار کرتی رہے

مذہبی اور نسلی نفرت کا لاوا ریلوے انجن

کے بوائلر کی طرح اندر ہی اندر کھولتا رہتا ہے جو

موقعہ پاتے ہی پھٹ پڑتا ہے۔ اور اپنے ساتھ سب کچھ
بہا کر لے جاتا ہے۔ علاقائی تعصب اور فرقہ وارانہ
فسادات آج طرزِ زندگی بن گئے ہیں آج فسادات
اور جنگ پر جو نظمیں کہی جا رہی ہیں ان میں ندا کی
نظمیں ایک الگ انداز رکھتی ہیں۔ اور کئی لحاظ سے
وہ ان نظموں اور افسانوں سے الگ ہیں۔ جو تقسیم
وطن کے بعد لکھی گئی تھیں۔ ندا کا موضوع چاہے فساد
ہو یا جنگ یا دو ملکوں کے بیچ دشمنیاں ان کا ایک الگ
انداز اور الگ treatment ہے یہ نظمیں آج
کے دور کے مزاج کا آئینہ دار ہیں۔ اپنے پیش رو
کی طرح انھوں نے سرحد کو مان کر قبول کر کے
شاعری نہیں کی بلکہ انہوں نے سرے سے اس سرحد
کو نہیں مانا ہے۔ جو جسموں پر سے گزار دی گئی ہے
اس سرحد پر وہ آدھے ادھر ہیں آدھے اُدھر۔

پاسپورٹ افیسر کے نام

کراچی ایک ماں ہے
بمبئی بچھڑا ہوا بیٹا
یہ رشتہ پیار کا پاکیزہ رشتہ ہے جسے اب تک نہ کوئی
توڑ سکتا ہے نہ کوئی توڑ پایا ہے۔ غلط ہے ریڈیو
جھوٹی ہیں سب اخبار کی خبریں۔
نہ میری ماں کبھی تلوار تانے رن میں آئی ہے
نہ میں نے اپنی ماں کے سامنے بندوق اٹھائی ہے
یہ کیسا شور و ہنگامہ ہے
یہ کیسی لڑائی ہے

جنگ

ہر گلی کوچوں میں گھس کر
بند دروازے کی سانکل کھولتی ہے
مدتوں تک
جنگ
گھر گھر بولتی ہے

سرحد پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد جنگ پر
لکھی گئی نظموں میں انھوں نے یہ سوال بھی اٹھایا
ہے کہ دو ملکوں میں جب جنگ ہوتی ہے تو سپاہی
لڑتا ہے اور مرتا ہے۔ اور شہید کہلاتا ہے سوال یہ
پیدا ہوتا ہے کہ دو ملکوں کے درمیان جب جنگ
ہوتی ہے تو دونوں طرف کے سپاہی یہ سوچتے ہیں
کہ وہ حق پر ہیں۔

تم فوج میں بھرتی ہونا چاہتے ہو
ضرور ہو
لیکن یاد رہے

جنگ کے دوران تمہارا ملک جو کہے گا وہ
سچ ہوگا
اور اس سچ کیلئے
تمھیں اپنی جان سے کھیلنا ہوگا
تمہارے دوستوں اور دشمنوں کی
فہرست سیاستوں کی طرح بدلتی رہے گی
جنگ ختم ہونے کے بعد
تم امر شہید بھی ہو سکتے ہو
اور بے وقوف بھی

بہت مشکل ہے بنجارہ مزاجی
سلیقہ چاہیے آوارگی میں

لفظ سفر ندا کی شاعری کا ایک کلیدی لفظ ہے ان کی شاعری کا نمایاں رنگ بھی۔ مورناچ جو دسمبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ندا نے لکھا تھا لفظوں کا پل کی بیشتر نظمیں اور گیت اپنے لسانی دائرے سے نکل کر ملکی و غیر ملکی زبانوں میں بھی مقبول ہو چکے ہیں لفظوں کا پل سے مورناچ تک ندا کا شعری سفر قصباتی محرومیوں کے ساتھ شہری صلابت سے ٹکراتا ہوا گزرتا ہے۔ اس میں سوانحی انداز میں موجودہ عہد کے اتار چڑھاؤ کو منعکس کیا گیا ہے۔ لیکن لب و لہجہ کی دردمندی اس شاعری کو شخصی مسائل کا اظہار ہوتے ہوئے بھی ہم سب کے دکھ سکھ کی کہانی بنا دیا ہے اس نظم سے وہ شخص زیادہ باتیں کر سکتا ہے۔ جس نے اپنی ماں کو جھری دار چہرے اور ہاتھ پر ابھری لکیروں کے ساتھ گوبر اور مٹی سے کچی دیواروں کے زخموں کو بھرتے دیکھا ہو۔

......میری ماں ہر دن اپنے بوڑھے ہاتھوں سے
ادھر ادھر سے مٹی لا کر
گھر کی کچی دیواروں کے زخموں کو بھرتی رہتی ہے
تیز ہواؤں کے جھونکے سے
بیچاری کتنا ڈرتی ہے۔
میری ماں کتنی بھولی ہے

میں ندا کی یہ نظم جب بھی اپنے ذہن میں دہراتا ہوں بے ساختہ مجھے میری ماں یاد آجاتی ہے اور وہ منظر میری آنکھوں میں زندہ ہو جاتا ہے جب کرفیو کے سناٹے میں ماں گھر کی کچی دیواروں میں مٹی بھرا کرتی تھی تاکہ فساد اور کرفیو گھر کے اندر نہ گھس جائے۔

ندا کا ایک مخصوص میدان دوشیزۂ فطرت کی نقاب کشائی ہے۔ گاؤں میں بھی اور شہر میں بھی۔ بھور، سردی، پہلا پانی، سحر، دوپہر شام، اور صبح ایک دن، ان کی ایسی ہی نظمیں ہیں جن میں گاؤں اور شہر دونوں نغمہ ہیں

سورج!
ایک نٹ کھٹ بالک سا
دن بھر
شور مچائے
ادھر ادھر چڑیوں کو بکھیرے
کرنوں کو چھترائے
قلم، درانتی، برش، ہتھوڑا
جگہ جگہ پھیلائے
شام
تھکی ہاری ماں جیسی
ایک دیا ملکائے
دھیمے دھیمے
ساری بکھری چیزیں چنتی جائے!

یہ نظمیں نہیں پینٹنگز ہیں جس میں شاعر نے فطرت کو مرئیز کر دیا ہے۔

بڑے شہروں کا جو احوال ہے اور مشینی زندگی، بے حسی، بے چہرگی، نے فطرت، موسم اور انسان کا جو حلیہ بنا رکھا ہے اس کا بڑی شدت سے بیان ہوا ہے۔ شہری مزاج کا یہ بھی ایک پہلو ہے کہ یہاں سورج پہلے نہیں نکلتا بس اور مشینیں پہلے نکلتی ہیں۔

یہ کیسی بستی ہے۔
میں کس طرف چلا آیا
فضا میں گونج رہی ہیں ہزاروں آوازیں
سلگ رہی ہیں ہواؤں میں ان گنت سانسیں
جدھر بھی دیکھو
کھوے، کولھے، پنڈلیاں، ٹانگیں
مگر کہیں
کوئی چہرہ نظر نہیں آتا (بمبئی)

اس مضمون میں، میں نے شاعر کے گیتوں اور دوہوں کا ذکر نہیں کیا۔ اس صنف سخن میں ان کی اپنی الگ دنیا ہے۔ انہوں نے دوہوں اور گیتوں میں عوامی زبان اور اردو ہندی کو شیر و شکر کر دیا ہے۔ اور زبان و اسلوب کے نئے پیرایہ بیان دریافت کیے ہیں۔ اس نئے محاورے

کی دریافت کے ساتھ ان گیتوں میں الھڑپن اور
جذب و مستی کی جو کیفیت شامل ہے وہ پڑھنے
سے تعلق رکھتی ہے۔

ساحر لدھیانوی کو یہ ناز تھا کہ انکی شاعری
ہر دور میں زندہ رہیگی۔ اور پڑھی جاتی رہے گی
کیوں کہ ہر دور میں لوگ جوان ہوتے رہیں گے
اور محبت کرتے رہیں گے۔ ندا فاضلی سے میری
ملاقات اسماعیل یوسف کالج میں ہوئی تھی۔ جب
وہ اور ڈیوڈ ڈیتھوز مدعو تھے ان کے ملنے سے
پہلے میں ان کی رومانی نظموں کا اسیر ہو چکا تھا

نیم تلے دو جسم اجانے
چھم چھم بہتا ندیا جل
اڑی اڑی چہرے کی رنگت
کھلے کھلے زلفوں کے بل
دبی دبی کچھ گیلی سانسیں
جھکے جھکے سے نین کنول
نام اس کا؟ دو نیلی آنکھیں
ذات اس کی رستے کی رات
مذہب اس کا بھیگا موسم
پتا... بہاروں کی برسات

ساحر لدھیانوی کا بیان ندا فاضلی پر بھی
صادق آتا ہے۔ ندا فاضلی کی نظمیں کالج کے طلبار
اور طالبات کی کاپیوں پر لکھی ملتی ہیں اور غزلوں کے
حوالے سے میر، غالب، مومن اور خواجہ میر درد کی
بات چلے۔ اور ندا فاضلی کا ذکر آئے تو طلبار و طالبات
اٹینشن ہو جاتے ہیں۔ اور ندا فاضلی کی نظمیں اور
اشعار کاپیوں پر نوٹ کرنے لگتے ہیں۔

اچھا ہے ندا فاضلی نے افسانے نہیں لکھے
اگر وہ افسانے لکھ جاتے تو اچھے اچھے افسانہ
نگاروں کی چھٹی ہو جاتی۔ کہانی کو اس کا چہرہ
لوٹانے کا دعویٰ کرنے والے اور افسانہ نگار جو
فکشن میں مین را اور سریندر پرکاش کے بیچ میں
کہاں؟ کی آواز لگاتے ہانپ ہانپ جاتے ہیں
وہ پٹری سے اتر جاتے یا جھکے سے بیانیہ انداز میں
اپنے نٹ بولٹ ڈھیلے کر لیتے۔ ثبوت اور مثال
کے لیے ملاحظہ فرمایئے۔ ان کی نثری تخلیق ملاقات
جس سے باغی، سرکش، سر پھرے۔ اور درویش
ڈسٹرب ہیں۔

ندا پر یہ مضمون مکمل نہیں ہے۔ نامکمل لفظ
میں نے سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے

یہ سچ ہے کہ ندا کی شاعری میں استحکام ہے۔
لیکن یہ بھی ہے کہ ان کی بہت سی نظمیں صرف
(statement) بہت سی مشہور نظمیں
فارسی دوسری زبانوں کے اقوال زریں
سے ماخوذ ہیں مگر بحث کا یہ دوسرا رُخ ہے
جسے میں دوسروں کے لیے چھوڑتا ہوں ان کی
غزلوں پر لکھنا ایک الگ اور مستقل موضوع ہے
جو ایک مفصل مقالے کا طلبگار ہے سردست ندا
فاضلی کی اب تک کی شاعری کا ایک تاثراتی
جائزہ لینا مقصد تھا اور ویسے بھی۔

کچھ باتیں ان کہی رہنے دو
کچھ باتیں ان سنی رہنے دو
ایک اوجھل بے کلی رہنے دو
ایک کھڑکی ان کھلی رہنے دو
سب باتیں دل کی کہہ دی اگر
پھر باقی کیا رہ جائے گا

ابرِ تر کی بے مثال کامیابی کے بعد
جواں فکر شاعر
فرید پربتی کا دوسرا
شعری مجموعہ
آبِ نیساں
قیمت ——— 150/-

نئے رجحانات کا ادبی منظر نامہ
سہ ماہی توازن
ایڈیٹر عتیق احمد عتیق نیا پورہ مالیگاؤں

دوسرا شجر۔ وادین اور مصرعِ ثانی کے

بعد

شجاع خاور کے شعری سفر کے تیس سال

کا سنگِ میل

مجموعۂ غزلیات

رشکِ فارسی

زیرِ ترتیب

اجراء ۱۹۹۳ء میں

رابطے کیلئے۔ ناشر: غزل آباد کلچرل سوسائٹی دلی

۱۶۶۵۔ رودگران لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶

ندا فاضلی - اپنے لہجے کی دریافت

بشر نواز

سسرو نے نوجوان مقرر نے کہا میں ہو بہو آپ لہجے میں تقریر کر سکتا ہوں۔ "بہتر ہوتا تم اپنے لہجے میں بات کر سکتے"۔ سسرو کا جواب تھا۔ اپنے لہجے کی دریافت دراصل اپنی شخصیت کی دریافت ہے اور سسرو یہی نکتہ اپنے نوجوان شاگرد کو سمجھانا چاہتا تھا۔ تخلیقی عمل اپنی تلاش و جستجو کا فنی اظہار ہوتا ہے چنانچہ ہر تخلیق کار کو اپنا انداز اظہار خود دریافت کرنا پڑتا ہے۔ دریافت کا یہ عمل پیچیدہ بھی ہوتا ہے اور اکثر بھٹکانے والا بھی۔ پیچیدہ یوں کہ اس میں کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ جنہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عوامل ماضی و حال کے نئے رشتے کی تعمیر، اور اس رشتے کے جمالیاتی توازن کے مراحل ہیں۔ اور بھٹکانے والا یوں کہ اکثر تخلیق کار اجتہاد کے شوق میں ہیئت پرستی اور اور لفظی کرتب بازی کا شکار ہو جاتے ہیں

ہوتا یوں ہے کہ اپنے لب و لہجہ کی تلاش کا عمل شخصیت کے شعور کے ساتھ شروع ہوتا ہے جہاں یہ شعور اس تلاش میں شامل نہیں ہوتا وہاں زبان فیشن زدہ چمک دمک سے ضرور آراستہ ہو جاتی ہے۔ لیکن اس میں زندگی کی حرارت نہیں پیدا ہوتی۔

ندا فاضلی کی بڑی کامیابی یہ ہے۔ کہ انہوں نے ان کرتب بازیوں اور لفظی کلیشیز میں (جنہیں جدید شاعری کے ابتدائی دور میں مکتبی قسم کے نقادوں کا اعتبار حاصل تھا) الجھے بغیر اپنا لہجہ پا لیا ہے وہ اپنے موضوع اور لہجے کو ہم آہنگ کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور اپنے انداز اسلوب سے جدید شاعروں کی بھیڑ میں الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہر لہجے اور اسٹائل کی کچھ تحدیدات ہوتی ہیں۔ یعنی ہر موضوع ہر لہجہ میں پوری طرح

اپنا اظہار نہیں پا سکتا۔ مثلاً کسی پیچیدہ فلسفیانہ موضوع کے لئے سیدھا سادھا انداز ناکافی ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی ہلکے پھلکے جذبے کے بیان کے لئے بھاری بھرکم الفاظ مضحکہ خیز صورت حال پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ انداز فکر کسی حد تک صحیح ہوتے ہوئے بھی مکمل صداقت نہیں ہے۔ موضوع اور لہجہ کا یہ تفاوت فنکارانہ بصیرت کی کمی کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اور صرف انہیں لوگوں کے لئے مسئلہ بنتا ہے جو اپنا اسٹائل اپنی شخصیت کے شعور سے اخذ کرنے کے بجائے کتابوں اور پیشرو فنکاروں کے فنی نمونوں سے حاصل کرتے ہیں۔ ترقی پسند شاعروں میں سردار جعفری کے یہاں اب جو فیض کے اندازِ اظہار کی تقلید نمایاں ہے وہ شخصیت کے اسی شعور کی ناپختگی کی غماز ہے۔ کسی شاعر کے الفاظ یا تراکیب کی نقل تو ممکن ہے لیکن الفاظ کے پیچھے جو روح کارفرما ہوتی وہ بنا شخصیت کے رچاؤ کے آسانی سے گرفت میں نہیں آتی۔

شخصیت ہی اسلوب ہے موضوع کا انتخاب شخصیت ہی کے تابع ہوتا ہے اس لئے موضوع اور اسلوب میں دوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر فنی نقطہ نظر سے یہ نظریہ بھی سطحی معلوم ہوتا ہے کہ پیچیدہ موضوع صرف پیچیدہ ہیئت اور نامانوس زبان ہی میں اظہار پا سکتا ہے۔ دراصل ہیئت و زبان کا پیدا کردہ الجھاؤ موضوع کی تہہ داری سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا بلکہ اکثر اوقات تہہ داری کا واہمہ پیدا کر کے گمراہ کر دیتا ہے۔ کئی جدید شاعر اس گمراہی کے اب تک شکار ہیں۔ وہ لفظوں کے لغوی الجھاؤ کو تہہ داری سمجھنے کی بھول کرتے ہیں۔ ندا فاضلی کے ہاں الفاظ کے غیر ضروری ہیر پھیر کے بجائے جذبہ اور احساس کی تہہ داری ملتی ہے۔ ان کے سیدھے سادے الفاظ کے پیچھے سوچتے ہوئے ذہن کی اور تہہ در تہہ احساسات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے اشعار معنوی اعتبار سے وہاں شروع ہوتے ہیں جہاں لفظ ختم ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ندا کے ہاں الفاظ مکمل معنی دینے کے بجائے احساساتی امکانات کی نشان دہی کرتے ہیں اور احساس کی شدت معنوی تہہ داری بن جاتی ہے۔

زندگی انتظار جیسی ہے ٭ دور تک رہ گزار جیسی ہے

یا

پہلے بھی جیسے تھے مگر جب سے کی ہے زندگی ٭ کچھ نہیں ہے بس ابھی دور ابھی ہوئی زندگی

یہاں انتظار اور رہ گذر کا تلازمہ ایک نئی معنوی
جہت کو جنم دیتا ہے اور جب زندگی انتظار بن جاتی ہے
تو رہ گذار عام راستہ نہیں رہ جاتا کسی غیر مرئی کیفیت
کا احساس دلاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں
پہلے بھی جیتے تھے اور جب سے ملی ہے زندگی کو
شخصی معنٰی دیے گئے ہیں۔ جیتے تھے اور زندگی کے
معنوی تضاد سے جو وسعت اور
ابھرے ہیں وہ بھی شدتِ احساس کا
ہی جادو ہے۔

ندا فاضلی کے پاس احساسات کی تجسیم اور
اشیاء کو غیر مرئی یا غیر مرئی جذبوں کو اشیاء کا
روپ دینے کا رویہ عام ہے۔ چنانچہ کبھی زندگی
ایک آنکھ سے ہنستی اور ایک آنکھ سے روتی
نظر آتی ہے۔

یہاں انہوں نے گریک دیوتا جینوس کو
زندگی کی علامت بنایا ہے۔
کہیں موسم چہرے بن جاتے ہیں۔ کبھی خواب
ستاروں کا روپ لے لیتے ہیں اور کبھی خدا
کسی پھول، کسی تتلی، کسی بچے کے تبسم میں مجسم ہو جاتا ہے
ندا کی زبان تصویری ہے۔ یہ لوک بھاشا کا وہ
ارتقائی روپ ہے جس کے ابتدائی نقوش برج
اودھی اور کھڑی بولی کی بھگتی شاعری میں ملتے ہیں

ایک سے ہو گئے چہرے یوں کہ موسم کے سہارے
مری آنکھوں سے کہیں کھو گیا منظر میرا

کس سے پوچھوں کہ کہاں گم ہوں کئی برسوں سے
ہر جگہ ڈھونڈتا پھرتا ہے مجھے گھر میرا

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو
چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں گے

جس طرح بجلی کے مثبت اور منفی کرنٹ کو ایک تار
کے ذریعہ ملانے سے روشنی پیدا ہوتی ہے اسی طرح
ندا کے ہاں دو متخالف احساسات و جذبات فنکاری
کے ان دیکھے رشتے سے جڑ کر معنوی چکاچوند
پیدا کرتے ہیں یہ کیفیت قدیم شعری صنعت اجتماع
ضدین سے یوں مختلف ہے کہ ان میں اشیاء یا
احساسات کو ان ظاہری روپ میں نہیں بلکہ باطنی
کیفیات کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے۔ یہاں محض
تضاد سے معنی جنم نہیں لیتے۔ بلکہ بیک وقت پیدا
ہونیوالی فضیاتی شعریت شعر کی بنیاد بنتی ہے۔

- اس اندھیرے میں تو ٹھوکر ہی اجالا دے گی۔
- ہر چمکتی قربت میں کوئی فاصلہ دیکھوں

- نیند میں بھی وہ جاگتا ہی ملا۔
- کوئی بادل چھپا تھا تشنگی میں۔
- جیون شور بھرا سناٹا
- اب کے جو گھٹائیں برسات میں جل کر دیکھیں

موضوعاتی اعتبار سے یہی رویہ زندگی کے تضادات کی طرف ندا کو متوجہ کرتا ہے۔ چنانچہ اُن کی نظم جنگ جہاں ختم ہوتی ہے وہیں سے شروع ہوتی ہے اور جنگ کے بعد کے سکون میں جنگ کی ہولناکی اپنا احساس دلاتی ہے

سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد
جنگ
بے گھر
بے سہارا
سرد خاموشی کی آندھی میں بکھر کے
ذرہ ذرہ
پھیلتی ہے
تیل
گھی
آٹا کھنکتی چوڑیوں کا روپ لے کر
بستی بستی ڈولتی ہے۔
ہر گلی کوچے میں گھس کر
بند دروازوں کی سانکل کھولتی ہے
مدتوں تک جنگ گھر گھر بولتی ہے

زندگی اور موت کا بظاہر یہ تضاد والد کی موت پر ایک نظم میں ایک نئی اور غیر متوقع جہت اختیار کرتا ہے۔ اور زندگی کے تسلسل کا احساس دلاتا ہے یہاں موت ہر چیز کا اختتام نہیں بنتی بلکہ ایک سلسلہ در سلسلہ سفر بن جاتی ہے۔ شکلیں اور چہرے بدلتے ہیں لیکن زندگی چلتی رہتی ہے۔ یہ نظم اپنے موضوع کے برتاؤ اور جذباتی نظم و ضبط کے لحاظ سے اردو کی اہم نظموں میں سے ایک ہے

تمہاری قبر پر میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اڑائی تھی
وہ جھوٹا تھا
مری آنکھیں تمہارے منظروں میں قید ہیں اب تک
میں جو بھی دیکھتا ہوں، سوچتا ہوں
وہ وہی ہے
جو تمہاری نیک نامی اور بدنامی کی دنیا تھی
کہیں کچھ بھی نہیں بدلا۔

تمہارے ہاتھ میری انگلیوں میں سانس لیتے ہیں
میں لکھنے کے لئے جب بھی قلم کاغذ اٹھاتا ہوں
تمہیں بیٹھا ہوا میں اپنی ہی کرسی میں پاتا ہوں

ہاں زندگی شکل اور جسم کے حدود توڑ کر وسیع تناظر میں نظر آتی ہے۔ بظاہر سیدھے سادے الفاظ ایک خاص ترتیب پا کر نظم کا تانا بانا بنتے ہیں اور نظم مصرعوں میں نہیں بلکہ پوری اکائی کی صورت میں اپنی معنوی تہیں کھولتی چلی جاتی ہے۔ موت اور زندگی کے فلسفہ پر عام طور پر بھاری بھرکم ڈکشن استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے ندا فاضلی کے ہاں ڈکشن مقصود بالذات نہیں ہوتا بلکہ اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس میں حرارت اور جان کتابی صداقتوں کے بجائے نجی تجربے یا کبیر داس کے لفظوں میں الوبھوگا وسوداگی ہے۔ سے آتی ہے اس لیے اس میں لفظ کہیں بھی احساس یا خیال پر حاوی ہی نہیں ہونے پاتا۔

دراصل ندا کا اسلوب بڑا دھوکہ دینے والا ہے۔ انہوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے

لائبریریوں میں محفوظ زبان نئے عہد کی غیر محفوظیت کے لئے ناکافی ہے۔ اس زبان کو تخلیقی سطح پر فعال بنانے کے لیے کتب خانوں سے باہر نکال کر دوبارہ گلی، کوچوں، کوٹھوں، چائے خانوں اور بھیڑ بھاڑ سے متعارف کرانا چاہیے۔

ندا اپنی زبان وہاں سے اٹھاتے ہیں جہاں سے شائستہ ادیبوں کا گذر ہمیشہ ممنوع رہا ہے کبیر داس اور نظیر کو اس جرم کی سزا برسوں بھگتنی پڑی۔ ندا فاضلی بھی انہیں ادبی کے گروہ سے جڑے ہوئے ہیں۔ زبان کے تعلق سے یہ رویہ ندا کی طاقت بھی ہے کمزوری بھی۔ طاقت یوں کہ عام بول چال کے الفاظ قاری کو فوری متوجہ کر لیتے ہیں۔ اور کمزوری یوں کہ انہیں الفاظ اور انداز اظہار کی وجہ سے اونچے آسن پر بیٹھے والے شاعر کی تہہ در تہہ احساسات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے کیونکہ وہ یہ مصنوعی تزئین اور موروثی آرائش کو ہی شعری زبان سمجھتے ہیں۔

مثال کے طور پر ندا کے ہاں ایک لفظ گھر بار بار استعمال ہوا ہے۔

تم جو سوچو وہ تم جانو ہم تو اپنی کہتے ہیں
دیر نہ کرنا گھر جانے میں ورنہ گھر کھو جائیں گے

پہلے ہمیں بھی نیند نہ آتی تھی گھر سے دور
اب جس جگہ بھی رات پڑی تھک کر سو گئے

گھر سے نکلے تو ہو سوچا بھی کدھر جاؤ گے
ہر طرف تیز ہوائیں ہیں بکھر جاؤ گے

چار دیواروں سے گھر باندھ کے جب وہ اترا
جسم تھا اس کا
پسینے سے شرابور مگر
اس کو آرام کی مہلت نہ ملی

شہر تو بعد میں ویران ہوا
مرا گھر خاک ہوا تھا پہلے

یہاں گھر صرف چار دیواری اور چھت کا ہی نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ذہنی کیفیت ہے۔ جس میں سکون، تحفظ کا احساس اور تنظیم ہے۔ ندا فاضلی کے ہاں۔ گھر کی نوعیت دیگر شاعروں سے مختلف ہے ندا نے اپنے گھر کو دو بار کھویا ہے۔ پہلی بار اس سے یہ گھر سیاست کی چیرہ دستیوں نے چھینا تھا جس کا ذکر ندا نے اپنے پہلے مجموعہ لفظوں کا پل کے دیباچہ میں کیا ہے۔

اور دوسری بار بہت دنوں کے بعد جب وہ کراچی گیا تو اسے اپنے ہی گھر میں اپنا گھر نہیں ملا

میں برسوں بعد
اپنے گھر کو تلاش کرتا ہوا اپنے گھر پہونچا
لیکن اب میرے گھر میں
میرا گھر کہیں نہیں تھا (گھر ستارہ)

یہ بے گھری ایک فرد کی نہیں بلکہ پورے معاشرے کی ہے۔ بے گھری کے اس احساس کو جب ہم خدا کے تصور سے ملا کر دیکھتے ہیں تو بات زیادہ واضح اور واشگاف انداز میں سامنے آتی ہے

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کرلیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

یا

روز میں چاند بن کے آتا ہوں
دن میں سورج سا جگمگاتا ہوں
کھنکھناتا ہوں ماں کے گہنوں میں
ہنستا رہتا ہوں چھپ کے بہنوں میں

مسجدوں میں سجدوں کی مشعلیں ہوئیں روشن
بے چراغ گلیوں میں کھیلتا خدا دیکھوں

یہ خدا ہے جو ایک بے جائے معلوم سے معاشرے کی ہر ہر چیز میں جلوہ نمائی کرتا رہا ہے۔ اس خدا کو آسمانی دھندلکوں میں ڈھونڈنے کے بجائے

ندا نے زمین پر سانس لیتے رشتوں میں تلاش کیا ہے
جو وحدانیت کے تصور خدا سے زیادہ قریب ہے
رشتوں کی اس تنظیم کے ٹوٹ جانے اور اس کے
ساتھ انسانی فطری معصومیت کی دردناک موت کے
بعد انسان ضرورت سے زیادہ تنہا اور غیر محفوظ
ہو جاتا ہے۔

یہیں تھا وہ
یہیں بچوں کی آنکھوں میں
لہکتے سبز پیڑوں میں
وہ رہتا تھا
ہواؤں میں مہکتا تھا
ندی کے ساتھ بہتا تھا (خدا کا گھر نہیں کوئی)

تو کیا اب خدا قصۂ پارینہ بن چکا ہے؟ نہیں
آج کا انسان ہی اپنی بصیرت کھو چکا ہے اس کی
نگاہیں روشن نہیں رہیں، اس تیز رفتار اور تجارتی
معاشرہ نے اس کائنات کے اندرونی روابط اور
رشتوں کو دیکھ سکنے کی صلاحیت چھین لی ہے

ہمارے پاس وہ آنکھیں کہاں ہیں
جو پہاڑی پر چمکتی بولتی آواز کو دیکھیں
ہمارے واسطے اب پھول غنچے ہیں
نہ کونپل گنگناتی ہے
نہ خاموشی اندھیروں میں سنہرے گیت گاتی ہے
ہمارا عہد ماں پیٹ سے اندھا ہے بہرا ہے
ہمارے آگے پیچھے موت کا تاریک پہرہ ہے
(خدا کا گھر نہیں کوئی)

گھر، خدا اور شہر، ندا فاضلی کی شعری رامائن کے
تین کردار ہیں۔ اس تکون کا ڈرامائی منظر نامہ
ہی اس کی شاعری ہے ایک طرف اپنے دور کی
کوتاہیوں۔ محرومیوں کا احساس اور دوسری طرف
اپنے خوابوں کی جیتی جاگتی دنیا کی آرزو ندا پر نہ صرف
خواب اور حقیقت کے درمیان فاصلوں کو واضح
کرتی ہے۔ بلکہ اسے موجودہ زندگی کے اندرونی تضاد
کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے۔ یہ تضاد صرف ایک فنکار
کی خیالی اور حقیقی دنیاؤں ہی میں نہیں بلکہ عام زندگی
میں بھی قدم قدم پر نظر آتا ہے۔ بھرے پُرے شہروں
میں تنہائی کے احساس، دوستوں اور محبتوں کے
کھوکھلے پن، روحانی اقدار کے زوال اور تہذیبی انحطاط
کے ماحول میں زندگی کرنا آج کے شعور کا مقدر ہے

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

تیرا سچ ہے ترے عذابوں میں
جھوٹ لکھتا ہے سب کتابوں میں

لیکن ندا کی شاعری جدید شاعری کے عام چہرہ کی طرح ہر دم رونے بسورنے کی قائل نہیں ہے وہ زندگی کے درد و کرب کو زندگی کا مقدر نہیں سمجھتا ہے۔ اس کے لہجے کا نکیلا پن اور طنزیائی جھلاہٹ زندگی سے ریاکارانہ سمجھوتہ نہیں بلکہ اسے اپنے طور پر بدل پانے کا عزم بن کر ابھرتی ہے۔ اس عزم میں خود فریبی کی جگہ خود آگہی کی چمک ہے اس عزم کا رشتہ ذات کے حدود سے باہر اگر دوسروں کے غموں سے جڑ جاتا ہے

دنیا نہ جیت پاؤ تو ہارو نہ آپ کو
تھوڑی بہت تو ذہن میں ناراضگی رہے

تمہاری شکایت بجا ہے۔
مگر تم سے پہلے بھی دنیا یہی تھی
یہی آج بھی ہے
یہی کل بھی ہوگی۔
تمہیں بھی اس اینٹ پتھر کی دنیا میں
پل پل بکھرنا ہے۔
جینا ہے مرنا ہے۔
مگر جب تلک یہ شکایت ہے زندہ، یہ سمجھو زمیں پر محبت ہے زندہ

ہمیں بھی شوق ہے اپنی طرح سے جینے کا
ہمارا نام بھی کیجئے عتاب میں شامل

دنیا کو اپنے طور سے جینے کی یہ کوشش مزید زخموں اور تلخیوں کے سوا کچھ نہیں دے پاتی۔ زمانے سے کچھ دن کی دوستی تو ممکن ہے لیکن شعوری بلوغت کے ساتھ زیادہ دور تک ساتھ نہیں دے پاتی۔

ہم ہیں کچھ اپنے لیے کچھ ہیں زمانے کے لئے
گھر سے باہر کی فضا ہنسنے ہنسانے کے لئے

یہ جھوٹی اور دکھاوے کی ہنسی خود فریبی کی ایک اور کوشش ہے۔ جس کا مقدر ناکامی کے علاوہ کچھ نہیں۔ چنانچہ ندا کے ہاں پھر ایک بار زندگی کو از سر نو سمجھنے کی کوشش ملتی ہے۔

اس اندھیرے میں تو ٹھوکر ہی اجالا دے گی
رات جنگل میں کوئی شمع جلانے سے رہی

گذرو جو باغ سے تو دعا مانگتے چلو
جس پہ کھلے ہیں پھول وہ ڈالی ہری رہے

شاعری جب اظہار کا وسیلہ بنتی ہے۔ تو ہیئت لفظیات اور فارمولوں کے حصار سے باہر نکل آتی ہے اس لئے ہم کسی شاعر کے کلام کو محض ٹکڑوں میں دیکھنے کے بجائے اس کی تخلیقی عمل اور تخلیقات کو کل کی شکل

میں دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہر ایسے اظہار کے پیچھے ایک
شخصیت کارفرما ہوتی ہے جو مسلسل تعمیر و تخریب کے
رد و بدل سے گذرتی رہتی ہے اس تبدیلی کا اظہار
فن میں ہوتا رہتا ہے۔ ندا کے ہاں اس کا احساس
تغفلوا، گاؤں کی ذہنی قربتوں۔ مورناج کے فرد
اور سماج کے ٹکراؤ اور نئی نظموں اور غزلوں میں
زندگی کو اپنے طور سے سمجھنے اور سمجھانے کے عمل میں
ملتا ہے۔ اکثر صورتوں میں معنوی تبدیلیاں شاعر
کی پسندیدہ ہیئتوں اور ڈکشن میں اندر ہی اندر
سرایت کرتی رہتی ہے۔ شاعر کا اسٹائل اور انداز
تو کم و بیش وہی رہتا ہے۔ لیکن اس میں ذہنی تبدیلیوں
کے ساتھ نئی نئی تہوں اور جہتوں کا اضافہ ہو جاتا ہے،
جسے عام زبان میں تہہ داری کہتے ہیں

ندا کی ابتدائی شاعری میں قصباتی معصومیت
اور سادگی ملتی ہے۔ بڑے شہر میں آنے کے بعد
اس سادگی کا تصادم یہاں کے تجارتی تعلقات
اور اس سے پیدا ہونیوالی ریاکاری سے ہوتا ہے
جس کے نتیجے میں ندا کے ہاں جھنجھلاہٹ اور ہر چیز
سے لڑجانے کا انداز جنم لیتا ہے۔ لیکن کھو کر سے
اجالا کشید کرنے کے شعور میں پھر ایک نئی دنیا کی
جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جس میں سبھی اکیلے رد
کے مارے ہیں۔ تضادات، دکھ، درد یہاں بھی ہیں
لیکن یہ کسی ایک فرد کا المیہ نہیں اسے ندا نے اپنی
فنی سوجھ بوجھ سے اپنے المیہ کو پورے معاشرہ
کا المیہ بنا دیا ہے۔

جو ملا خود کو ڈھونڈتا ہی ملا
ہر جگہ کوئی دوسرا ہی ملا

رشتوں کے ریگزار میں ہر سر پہ دھوپ ہو
ہر پاؤں میں سفر ہے مگر راستہ بھی ہو

کیا ضروری ہے کہ ہر پردہ اٹھایا جائے
میرے حالات میں اپنے ہی مکاں سے سینئے

ہم نہیں سوتا آدمی کی طرح
نیند میں بھی یہ جاگتا ہی ملا

ندا کی نئی نظموں غزلوں اور گیتوں میں فکری
کینوس بہت پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں اطراف
کے نقوش زیادہ واضح اور روشن نظر آتے ہیں
اور اس کے اشعار شخصی ہوتے ہوئے بھی غیر شخصی
انداز لئے ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ندا کی
شاعری میں اب تیسرے ابعاد کا ایک خوشگوار اضافہ
ہو رہا ہے۔

جو پائے وہ کھوئے اسے، جو کھوئے وہ رو رہا ہے

یوں تو سبھی کے ساتھ ہے کس کی ہوئی ہے زندگی

ہر راستہ انجان سا ہر فلسفہ نادان سا

صدیوں پرانی ہے مگر ہر پل نئی ہے زندگی

ہر اک تلاش یہاں فاصلوں سے روشن ہے

حقیقتیں کہاں ہوتی ہیں خواب میں شامل

ممکن ہے سفر ہو آساں اب ساتھ بھی چل کر دیکھیں

کچھ تم بھی بدل کر دیکھو، کچھ ہم بھی بدل کر دیکھیں

نظر کی یہ وسعت اسے زندگی اور زندگی کرنے کے ایک نئے انداز سے آشنا کرتی ہے اور دنیا اسے قابل نفرت نہیں بلکہ ہمدردی کی مستحق نظر آتی ہے

یہ ہی زمیں سفر ہے

یہ ہی زمیں منزل

نہ تم تلاش کرو مجھ میں جو نہیں ہوں میں

نہ میں تلاش کروں تم میں

جو نہیں ہو تم

اس انداز میں ہاتھ ملاتے رہنے والی ریاکاری کی جگہ شعوری ہوشمندی محسوس ہوتی ہے ندا کا شعری سفر ایک وسیع تر شاہراہ پر جاری ہے ابتدائی شاعری کی جھلاہٹ جیسے

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا

مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

اوروں جیسے ہو کر بھی ہم باعزت ہیں بستی میں

کچھ لوگوں کا سیدھا پن ہے کچھ اپنی عیاری ہے

اس قسم کے اشعار میں ممکن ہے فوری اپیل ہو ممکن ہے یہ کسی واقعے کے فوری ردعمل کے طور پر جلے گئیں لیکن رک کر اور واقعات کو زیادہ گہرائی سے دیکھنے والوں کے لئے ان میں ایک معصوم سی ناراضگی کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگر ندا کا ذہنی سفر یہیں رک جاتا تو یہ بڑی ٹریجڈی ہوتی لیکن وہ اس موڑ سے صحیح سلامت گزر گیا۔ اب بھی قدم قدم پر حادثوں کا سامنا تو ہے لیکن ان کے تعلق سے شاعر کا ردعمل فوری نہیں بلکہ سوچا سمجھا یا ورڈس ورتھ کے لفظوں میں

سے عبارت ہے۔ اس لحاظ سے

اس شعری نظر ظاہر موجودات کے پیچھے کارفرما محرکات تک اترتی نظر آتی ہے۔ اب زندگی اسے صرف سیاہ اور سفید کے خانوں میں تقسیم نظر نہیں آتی۔ بلکہ وہ اس کے ہر دم بدلتے رنگوں کو بھی دیکھ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اب اس کے لہجے میں ایک مخصوص ٹھہراؤ اور گمبھیرتا ملتی ہے۔ اس کے موضوعات آٹا گوندھتی

یا کچھ میں چپالی تو ترقی ترکی تک محدود نہیں رہے ندا انسانی تعلقات کی پیچ در پیچ نوعیتوں اور اپنے ساتھ دوسروں کی الجھنوں اور مجبوریوں کے شعور کے ساتھ مختلف اصناف میں ایک ساتھ طبع آزمائی کر رہے ہیں اب انہیں زندگی ایک آنکھ سے ہنستی اور ایک آنکھ سے روتی نظر آنے لگی ہے یہ آنسو اور مسکراہٹ کا سنگم ہی ان کی شاعری کی پہچان ہے۔ جس میں چاند پھول شاعر سب ایک ہی زندگی کے مظہر بن جاتے ہیں

چاند سے پھول سے یا میری زباں سے سنیئے
ہر جگہ ایک ہی قصہ ہے جہاں سے سنیئے

کیا ضروری ہے کہ ہر پردہ اٹھایا جائے
میرے حالات بھی اپنے ہی مکاں سے سنیئے

نکلے تھے جب سفر پہ تو محدود تھا جہاں
تیری تلاش نے کئی عالم دکھائے ہیں

زندگی کی معنویت کی یہی تلاش ندا کی شاعری کے سفر کی داستان ہے اور یہ سفر اب ایک نئی سمت اختیار کر رہا ہے اور یہ سمت وہ ہے جو بڑی شاعری کی بشارت ہے۔

×——×——×——○——×——×——×

دوہے

(ندا فاضلی کے نذر)

کھو کر پونجی سانس کی خوب کیا بیوپار
سیٹھ جی کچھ پاپ ہی سے کر چلے ادھار

در

دن دو دن یا چار دن، سب کا یہاں پڑاؤ
اس بستی میں خواب کے خیمے لاکھ لگاؤ

جب سے پہنا جسم کا خاکی ایک لباس
ہم تو اپنے آپ کی، بھول گئے بو باس

کہتی ہے یہ زندگی، اپنا رستہ ناپ
اک پہچانے موت ہی، سمے کی دھیمی چاپ

ہم نے کاٹا عمر کا، کیا یہ بن باس
یہ رامائن کون لکھے، کہاں میں تلسی داس

دنیا میں کس کام کے، یہ دھنوان بخیل
چھاؤں کیا دے پائے گا اونچا پیڑ وشکیل

سید شکیل دسنوی

ندا فاضلی کی ایک نظم

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

ندا فاضلی آج کی مشینی زندگی کے کرب کے
شاعر ہیں۔ کہیں انہوں نے جمالی قدر کی سماجی
اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے
کہ ہم عصر زندگی کی صحیح پہچان اُن کی شاعری میں
رقص و حرکت بن جاتی ہے۔ اور زندگی اپنی
تمام وسعتوں اور پورے جوبن کے ساتھ انکے
فن کی کائنات میں ڈھل جاتی ہے۔ ان کی بیشتر
نظمیں غزلیں اور گیت فن اور زندگی کا ایسا ہی
نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اسی ذیل میں ندا فاضلی کی
ایک نظم دو سہیلیاں بھی ہیں ؎

بیٹھے بیٹھے
ادب رہے ہیں

آؤ سہیلی سرپٹ بھاگیں
سر کے بال نگل بل جائیں۔ دھم دھم بولیں
دہلیزیں لانگیں۔
گھٹنوں گھٹنوں
تال میں چلکر
منہ منہ تک گاگر بھر لائیں
اور نشانے تاک تاک کر تیتر سے پتھر ٹکرائیں
برگد کی ننگی ڈالی پہ
بن جھولے کے
ایسا جھولیں
وکیٹ جھلے میں پھنس جائے۔ انگوٹھے پیشانی
چھولیں
ہنسی ہنسی میں
اک درجے پر
بدلی بن بن کر یوں ٹوٹیں
آئنے جیسا کس کر گوندھیں۔ کئی جگہ سے
ٹوٹیں پھوٹیں۔

ندا فاضلی کی یہ نظم ۱۹۶۷ء کی ہے ۱۹۶۶
میں ندا فاضلی نے اپنے بارے میں لکھا تھا ــــ
میں آج کا آدمی ہوں۔ سلگتے اندھیروں اور

جلتی دھوپوں کے جنگل میں سانسیں یعنی ایک اجنبی
آواز، آج کی لعنت ایک قدِ آدم ..... جو ہر وقت
میرے گلے میں طوق کی مانند لٹکا رہتا ہے۔ اس
آئینے نے میرے وجود کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے
میں جو آئینے کے باہر ہوں، جو آئینے کے اندر نظر
آرہا ہوں۔ اور اپنے ہی ننگے پن کے نشتر سے ہر دم اپنے
آپ کو گودتا رہتا ہوں۔ پر کٹے پنچھی کی طرح جب بھی
جست بھرنا چاہتا ہوں اوندھے منہ گر جاتا ہوں۔

ان دو زندہ گوشت کے ٹکڑوں کے درمیان
ایک اور (میں) ہے جو ایک تماشائی کی مانند اس
درمیانی فاصلے کو ناپتا ہے۔ اس تیسرے (میں) کو
کیا نام دوں۔ کیوں نہ اسے عصری نام سے پکارا جائے
ہم تینوں ایک دوسرے میں گھل مل جانا چاہتے
ہیں۔ ایک ہونا چاہتے ہیں۔ انگریزی نقاد بلہاپ
کنس اسی تکمیل و ارتباط کو موجودہ تہذیب کا ایک
بہت بڑا مسئلہ مانتا ہے۔ جس کے ساتھ ہی وہ
دھرتی کے مستقبل کو بھی جوڑ دینا چاہتا ہے۔ لیکن
کوئی حل؟ کتنی گہرائیاں، کتنی دوریاں، کتنی تنہائیاں
کتابی طلسمات شاید کہیں کام آتے رہے ہوں
مگر اب تو ان منتروں میں صرف گھسے پٹے الفاظ
ہی نظر آتے ہیں۔ حالانکہ بازاروں میں اب بھی
یہ کرنٹ کرنسی کی طرح بھنائے جاتے ہیں سانسوں
کی مضبوط رسی سے بندھا ہوا یہ تین ٹکڑے آدمی
...... کھانا پینا بھی ہے۔ ہنستا گاتا بھی ہے اور
کودنا اچھلنا بھی ہے۔ شاد عظیم آبادی کا شعر ہے ؎

غضب ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا
زمیں کا سخت ہو جانا فلک کا دور ہو جانا

ان ضرورتوں کی جبریہ تکمیل کے لئے جھوٹے چہرے
جھوٹی آوازیں —— اور جھوٹے آدرش کی نقابوں
سے وہ اپنے آپ کو چھپائے رہتا ہے۔ ہم سب
اپنے اپنے جھوٹ کو اپنے دائروں میں بناتے
سنوارتے رہتے ہیں۔

نئی شاعری اوپری نقابوں اور اندرون بکھراؤ کے
تضاد کا نفسیاتی ڈرامہ ہے۔ اردو میں ترقی پسند
شاعری صرف اوپری نقابوں کی شاعری تھی جو
بھیڑ کی ٹھہری ہوئی تصویر کشی تک محدود رہی۔ موضوعات
چلتی پھرتی زندگی سے نہیں بلکہ سوچی ہوئی زندگیوں
سے فارمولوں کی صورت میں لے جاتے تھے۔ چلتی
پھرتی زندگی میری مراد وہ زندگی ہے۔ جو افراد سماج
میں عملی طور سے جیتے ہیں۔ جس میں سیدھا پن نہیں

نئی نئی پیچیدگیاں، گرہیں، اور گتھیاں پڑی ہوتی ہیں
ترقی پسند بزرگ اوپری ڈھانچے (جو ہمیشہ نمائشی
ہوتا ہے) ہی کو پورا آدمی سمجھتے رہے۔ یہ ایک بڑی
غلط فہمی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۳۶-۳۵ کی بیشتر نظموں
میں تصویری نوک پلک اور سج دھج تو ہے مگر
سانسوں کی گرمی اور جسمانی حرارت کا احساس
نہیں ہو پاتا۔

نیا ذہن اس موروثی نقطۂ نظر کے خلاف
ایک گمبھیر رجحان ہے۔ نئی شاعری میں پورا آدمی
اپنے فطری روپ میں پھیلا ہوا ہے۔ دوڑتے پہیوں
کے ساتھ پیٹ کے بل گھسٹتا آدمی۔ بند کمرے میں
اپنے سے لڑتا جھگڑتا آدمی۔ بھیڑ میں رہتے ہوئے
شور و غل سے کتراتا آدمی۔ . . . نئی شاعری کے تیور
اثباتی نہیں منفی ہیں۔ اس کی اٹھان سوالیاتی ہے
زندگی کی رائج الوقت اقدار سے بے اطمینانی۔ نئی
تہذیبی سمتوں کا تجربہ اور سائنسی و صنعتی کھوکھلے پن
کا کڑوا احساس اس کی کینوس بناتے ہیں جس پر
ابھرے ہوئے نقش قاضی سلیم کے الفاظ میں
ہمارے چہروں کی طرح مختلف اور الگ الگ، ہر
فرد اپنے اندر ایک مکمل دنیا ہوتا ہے۔ نئی شاعری
کسی ایک دنیا کے بجائے کئی دنیاؤں کا لگاتار سفر ہے
نئے نئے تجربات، نئے نئے احساسات، نئے نئے
زاویے اس کی شناخت ہیں۔ ہر سچے آرٹ کی طرح
نئی شاعری میں اپنی ذات کے واسطے سے اپنے
عہد کا زندہ تجزیہ اور روح ہے

ندا فاضلی کی مندرجہ بالا نظم "دو سہیلیاں"
بھی زندہ تجربہ اور اپنے عہد کی روح ہے۔ اس
نظم پر ۱۹۶۰ء میں شاعر کا نام مخفی رکھ کر ڈاکٹر اختر
اورینوی اور طبراج کومل سے تجزیہ کرایا گیا تھا

اختر اورینوی لکھتے ہیں —— آج شام کو میرے
کمرے میں چند احباب کی نشست تھی۔ جدید شاعری
اور جدید افسانہ نگاری پر گفتگو شروع ہو گئی۔ ایک صاحب
نے مخالفت میں انتہا پسندانہ خیالات کا اظہار کیا
ایک نے مزاحیہ انداز میں تنقید کی۔ اور میں نے اس
امر کا اعلان کیا کہ آرٹ میں نئے اور پرانے کی تخصیص
فقط منہ کا مزا بدلنے کے لئے ہے۔ بنیادی معیار
اور بنیادی مطالبے ہمیشہ ایک جیسے ہوں گے ثانوی
باتوں میں تھوڑا تھوڑا فرق ہوتا رہتا ہے پھر ایک
عزیز شاگرد نے ایک جدید نظم سنائی۔ اور اس کے
متعلق یہ تھا کہ یہ اینٹی پوئٹری ہے میں نے کہا کہ

روا فسانہ نگاری میں انٹی پلوٹ اسٹوریز کے عنوان
سے چلی ہے۔ لیکن اب اگر بات یہاں تک پہونچ
گئی ہے تو ہم پس ماندہ طبقے میں شامل ہیں۔ یعنی
غیر شیریں شکر کا رواج عام ہو رہا ہے۔ اینٹی
پوئٹری پوئم میرے تصور سے باہر ہے۔ یہ کوئی
مابعد الطبیعاتی فلسفہ ہو سکتا ہے یا پھر مارکسین
یا ہیگلین تضاد۔ استعارے طور پر ہم ظلمت نیم روز
بھی کہہ دیتے ہیں لیکن حقیقت کے طور پر انٹی پوئٹری
پوئم کہنا عجیب بات ہے۔

پچھلے دنوں جولائی میں کشمیر ریڈیو نے احتشام حسین
آل احمد سرور، ہم تینوں کو نئی شاعری پر اظہار خیال
کرنے پر مدعو کیا۔ ایک سہ شاخہ مباحثہ شروع ہو گیا
بعض اختلاف کے باوجود ہم تینوں اس نتیجے
پر پہونچے کہ شاعری نئی ہو یا پرانی ہو یا ماورائی
ہو۔ اسے شاعری ہونا چاہیے۔ روح شعریت
کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ نظم کو ایک ہیئت عطا
کی جائے۔ ہیئت میں تبدیلی ہوتی رہیگی۔ کوئی
ضروری نہیں کہ ہم صرف روایتی ہیئتوں کو تسلیم
کریں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ تجربات شاعرانہ
بھی بندھے ٹکے ہوں۔ ماحول تہذیبی تقاضوں
اور مسائل کے بدلنے کی وجہ سے موضوعات بھی
بدلتے رہیں گے۔ ارتقار زبان و بیان کے ساتھ
شاعری کی نئی نئی صنعتیں بھی ہیئتی طور پر پیدا
ہوتی چلی جائیں گی۔ ہمیں نئے موضوعات سے
انحراف نہیں اور نہ نظم آزاد یا نظم معریٰ جھگڑا ہے
لیکن ہم جو ایک روح اور ایک قالب رکھتے ہیں
اب تک نہ تو عالم ارواح میں شامل ہوئے ہیں
اور نہ مٹی مل گئے ہیں۔ روح و قالب کی ہم آہنگی
کے بھی قائل ہیں۔ منثور اور معریٰ شاعری بھی ہماری
سمجھ میں نہیں آتی اور ایسی شاعری بھی پسند نہیں آتی
جو ہیئت کی زنجیری ہو۔ قالب اس لئے ہے کہ
روح کو اس دنیائے آب و گل میں کارفرما کارساز
بنائے اور روح اس لئے ہے کہ بے جان قالب کو
متحرک کر دے۔ لیکن ہم لوگ نہ تو جنات بلانے کے
قائل ہیں۔ اور نہ پلچھنڈ کی میز پر روح کو دعوت دینے
کے سحر کو حلال سمجھتے ہیں۔

ہمیں اس وقت کوفت ہوتی ہے جب ہیئت
کے نقشے میں لوگ ہر قید و بند سے آزاد ہو جانا چاہتے
ہیں۔ ثقافت ضابطے کا نام ہے اور شعر و ادب
ثقافت کی لطیف ترین صورت ہے۔ اسی سلسلے

کی ایک بات یہ بھی ہے کہ اردو کے نوسیکھ لوگ
چند مہینوں میں ریڈر، ایا ونڈ، جارج بارکر اسپنڈر
اوڈن وغیرہ میں جانا چاہتے ہیں اور اپنے خیال
میں بن چکتے ہیں۔ یہ مسئلہ آج سے بیس سال پہلے
بھی پیدا ہوا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے نتیجے میں
ایک سے ایک اناڑی اقبال اور میر کا منہ چڑانے
لگا تھا۔ چند سالوں کے اندر اندر یہ بلبلے پھوٹ
پھوٹ گئے۔ مجھے یقین ہے کہ جدید شاعری کے
بتاشے بھی دیر تک کام و دہن کو متاثر نہیں کر سکیں گے
ان کا قصور یہ نہیں کہ جدید ہیں بلکہ رونا یہ ہے کہ
جدید شاعری کی اکثریت کا نارورے دورے کا
شکار ہے اور جدیدیت پسندوں پر بڑے حضرت
فرائڈ سوار ہیں۔ پتہ نہیں ہماری اردو شاعری
اتنی اسرائیل کیوں ہوتی جاتی ہے۔ ہمیں کوئی
شکایت نہیں اگر جنس ہی اردو شاعری کا موضوع
بنے۔ لیکن جدید شاعری دو قطبین کے درمیان
رقص کرتی ہے یہی اس کا محور ہے۔ ماحول سے
بےزاری اور جنسی گھٹن۔ اس کا مطلب یہ کہ
دنیا میں اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ نتیجہ فرسودگی
نقالی۔ پٹی ہوئی لکیر پیٹنا۔ چبائے ہوئے لقمے چبا
اور وسعت اور تازگی کا فقدان۔

ابھی میرے سامنے چھوٹی سی نظم پیش کی گئی
کہ میں اس کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کروں آجکل
ایک چلتا ہوا فقرہ بہت "تیز رفتار" ہے۔ ہر ایک چیز
عظیم بن جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہ نظم نہ تو
عظیم ہے۔ نہ لطیف اور نہ اس کے اندر وہ خوبیاں
پائی جاتی ہیں جنھیں ہم تراشیدگی، بالیدگی اور سجاوٹ
کہتے ہیں۔ اس نظم میں شعریت کی بھی کمی ہے۔ ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ ناظم نے ایک نفسیاتی کیفیت کو
منظوم کرنے کی کوشش کی ہے اور میرا خیال ہے
کہ وہ اس میں کامیاب ہوا ہے۔ مرکزی تجربہ اوبتا
اکتاہٹ ہے۔ نہ جوش جوانی حرکت و عمل چاہتی ہے
لیکن جب میدان عمل نہ ہو اور گھر کی چار دیواری میں
اسے قید کر دیا جائے تو اچانک بند ٹوٹتا ہے اور
عملی تصادم سے ایک نفسیاتی اضطراب پیدا ہوتا ہے
اس نظم میں بہت ہی پر قوت تصویروں کے ذریعہ
ان کیفیات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں شاعری
کے بعض عناصر موجود ہیں۔ جذبہ، تخیل کی معمولی
کارفرمائی تصویر ہے۔ پیکر تراشی اور قلم بندی
اظہار بیان میں توانائی۔ لیکن کہیں کہیں یہ نقص بیان

اور عجز بیان موجود ہے۔ مثلاً سر کے بال تلک سل جائیں
تیز دوڑنے میں تو بال لہراتے ہی ہیں۔ ہل جانے
کی ترکیب عجیب و غریب ہے۔ اور "پیر تلک" کی
داد نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ بال ذرا سی حرکت پر
ہوا میں لہرانے لگتے ہیں۔ انگوٹھے، پیشانی جیسی
یہاں پر عجز بیان موجود ہے۔ کون سے انگوٹھے
ہاتھ کے یا پاؤں کے۔ مرکزیت خیال کے ساتھ
ہم آہنگی بھی موجود ہے۔ ابتدا یوں ہوتی ہے

بیٹھے بیٹھے
اوب رہے ہیں

اور اختتام یوں۔

آٹے جیسا کس کر گوندھیں
کئی جگہ سے ٹوٹے پھوٹیں

ابتدا اوبنے سے ہوتی ہے اور اختتام میں کردہ
گناہوں کی حسرت کی داد دی جاتی ہے۔ "ٹوٹے پھوٹے"
کا لفظ بہت ہی پر معنی ہے۔ گویا یہ لڑکیاں بھی بھری
ہوئی گاگریں ہیں۔ نظم نگار نے گاگر بھرنے کی

ظاہر ہے کہ اس نظم کی اندرونی لہر میں جنسی
ناآسودگی اور سرخوشی موجود ہے۔ اور دبی دبی

خواہشوں کا ردعمل تیز رفتار حرکت اور دھما چوکڑی
کے ذریعہ ہوتا ہے۔ دھم دھم یوں دہلیز میں لانگیں
دہلیز علامت ہے رکاوٹوں کی۔ انہیں پھلانگ
جانے کی خواہش ظاہر ہوتی ہے۔ دھم دھم اور
دہلیز میں صوتی ہم آہنگی بھی موجود ہے۔ قید اور
پابندی کی دیواریں توڑی جا رہی ہیں۔ پتھر سے پتھر
ٹکرائیں۔ ایک جنسی علامت بن جاتی ہے اور اس سے
جنسی میلان کا بھی پتہ چلتا ہے۔ پتھر علامت ہے اس
شے کی جسے جوش نے دکن کی پہاڑی دوشیزاؤں
دیکھا تھا۔ "آٹے جیسا کس کر گوندھیں" "بے جھولے
کے جھولیں"۔ اور "ننگی شاخیں" بھی جنسی علامتیں ہیں۔
اس نظم کی یہ خوبی ہے کہ اس میں نہ تو ابہام ہے
اور نہ کثافت۔ کبھی وضاحت کثافت میں بدل جاتی ہے
اور کبھی ابہام دھواں بن کر اڑ جاتا ہے یہ دھوانی
کیفیت بھی اس نظم میں نہیں پائی جاتی ہے یہ ایک
چھوٹی سی اوسط درجہ کی پراثر نظم ہے۔

بلراج کومل نے تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے
کہ اس نظم میں بوریت، وہ مقام ہے جہاں سے
نظم کا مرکزی خیال پرواز کرتا ہے۔ اوب جانے
کے بعد انسان کو تفریح کی ضرورت پیش آتی ہے

اس نظم کی لڑکیاں بھی زندگی کی یکسانیت سے غالباً
اوب ہو چکی ہیں - وہ سڑکوں پر سرپٹ بھاگنا چاہتی
ہیں - تال میں مل کر پانی کی گاگریں بھرنا چاہتی
ہیں - پتھروں سے نشانہ بازی کا کھیل کھیلنا چاہتی
ہیں - برگد کی ٹہنیوں سے جھولنا چاہتی ہیں اور
اس مسرت اور انہماک اور والہانہ پن سے جھولنا
چاہتی ہیں - تاکہ جسم و جان کی بوریت ختم ہو جائے
نظم کا آخری مصرعہ قدرے زیادہ دلچسپ ہے
کیونکہ اس میں اکتساب لذت کا وہ طریقہ تجویز کیا
گیا ہے جس کو ہم، ہم جنسیت یا HOMS
کا نام دیتے ہیں - آخری مصرع
شعری اعتبار سے ناقص ہے لیکن اس میں لڑکیاں
ایک دوسرے کو مٹی میں آٹے کی طرح گوندھنا
چاہتی ہیں - کسی جگہ سے ٹوٹنے پھوٹنے کا عمل ملبوسات
کی حدود سے کتنا آگے ہے - اس کا میں صرف
تصور کر سکتا ہوں - وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا
ممکن ہے بوریت پر قابو پائے یا اس سے نجات
پانے کا یہ طریقہ پہلے دو طریقوں سے زیادہ دلچسپ
اور لذت انگیز ہو - بہرحال اس نظم میں اس کا
اظہار معصومانہ ہے - مجرمانہ یا مریضانہ نہیں ہے

نظم کے مصرعوں میں روانی ہے جذبے کے ساتھ
مطابقت ہے - لیکن کچا پن اور نا تجربہ کاری کا
احساس ہے - نظم کی پوری فضا میں ایک کھلنڈرا پن ہے
ایک آزاد فضا ہے جو متاثر کرتی ہے - خاص طور پر
پہلے دو بندوں میں نجات پانے کا عمل دعوت
نظارہ اور دعوت اشتراک دیتا ہے - تیسرے حصے میں
دعوت نظارہ تو ہے - لیکن دعوت اشتراک سے
ایک دوسری نظم شروع ہو جائے گی اس دوسری
نظم کا ذکر میرے دائرہ عمل میں نہیں ہے!!
ندا فاضلی کی اس نظم میں وصل کی سرشاری
اور گراں باری کی تمنا دوسرے انداز سے ہے
لطیف احساس کی چاندنی ہے - کیف نہیں
بلکہ سرگوشیاں کرتی ہوئی ہے - ریاض رسیت
آزردہ بسیار ہے - کیونکہ اس نظم میں بند کواڑ
نہیں کھلتے - صرف دستک کی آواز آتی ہے نئے
دروازے دوسری شاہراہ پر کھلنے کے منتظر ہیں
وہ شاہراہ جہاں نہ رنگین و حریری ملبوسات ہیں
نہ کیف شراب، نہ خمار خواب سے لبریز آنکھیں
نہ رخساروں کے عشرت آلود غازے نہ سرخ
ہونٹوں پر تبسم کی ضیا - نہ مرمریں ہاتھوں کی

بقیہ صفحہ ۸۲ پر

نمرتا • سارے دن کا تھکا ہوا پرش ★ ایک دن بیت گیا

کے بعد

صلاح الدین پرویز کا نیا ناول

آئیڈینٹٹی کارڈ

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ

اردو ناول کو ایک نئی سربلندی اور امتیاز کی ایک نئی منزل سے ہم آہنگ کرنیوالا عظیم ناول

صلاح الدین پرویز کائنات کے تجربے کو لکھتا ہے اور اپنے تجربے کا سارا زہر اور سارا شہد ان میں نچوڑ دیتا ہے۔ تاریخ اس کے خون میں یاد بن کر موجزن ہے تجربہ اس کے قلب کا زخم ہے۔ مشاہدہ اس کی آنکھوں کا نور ہے اور جب یہ نور یہ زخم اور یہ یاد ملتی ہے تو صلاح الدین پرویز علامت در علامت زندگی کی تہوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ اس کی محبتیں اور نفرتیں اس کے دکھ اور خوشیاں اس کی عقیدتیں اور حقارتیں سب اس کے قلم سے ایک سیارہ روشنی کی صورت میں کاغذ پر بکھرنے لگتی ہیں اس کی سب سے بڑی محبت اس ذات گرامی سے ہے جو باعث تکوین کائنات ہیں۔ جن کا نور پیشانی آدم میں روح پھونکی جا رہی تھی۔ اور یہ محبت صلاح الدین کے قلب کا مرکز ہے اور اس مرکز میں جو روشنی ہے صلاح پرویز اس روشنی سے زندگی کی ہر واردات کو دیکھتا ہے اسے حضورؐ سے محبت ہے اور اللہ سے محبت ہے صحابہ کرام سے محبت ہے اہل بیت اطہار سے محبت ہے مسلمان عہد حاضر کی تاریخ میں جس ابتلا سے گزر رہے ہیں اور جس امتحان و آزمائش کے روبرو ہیں صلاح الدین پرویز اسے اپنا امتحان اور اپنی آزمائش سمجھتا ہے اور اسے ان کی ہر ابتلا اپنی روح کا زخم محسوس ہوتی ہے وہ محبتوں کی زبان بولنا چاہتا ہے مگر جب حقارت اور نفرت کے تلخ لفظ اس زبان پر آتے ہیں تو اس کی بجائی بھی محبت کے لفظوں سے کم نہیں ہوتی وہ مثبت و منفی کو ملانا جانتا ہے اور اور تضادات کی ہم آہنگی اور تضادات کے تصادم اور پیکار کا یہی کھیل صلاح کا فن ہے۔

(سلیم احمد مرحوم)

ضخامت ۲۵۶ صفحات ★ قیمت اسی روپیے

تقسیم کار

مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۵ | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۶

اخبار نو پبلی کیشنز ۲۱۳۴ ترکمان گیٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی

ندا فاضلی

آنکھ اور خواب کے درمیان

"آنکھ اور خواب کے درمیان" ندا فاضلی کا
تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل اس کے
دو شعری مجموعے لفظوں کا پل اور مور ناچ
منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس لحاظ سے ندا فاضلی
ایک ایسا نام ہے۔ جس کا ذکر ادبی تحریروں،
شاعروں اور ادبی محفلوں میں اکثر سنائی دیتا ہے
بعض اسے انتہائی بدمزاج، منہ پھٹ اور بدسلیقہ
قرار دیتے ہیں۔ بعضوں کے نزدیک وہ بڑا صاف گو
اور حقیقت پسند ہے جو زہر ہلاہل کو قند نہ کہہ سکنے کے
باعث اپنوں کو خفا اور بیگانوں کو ناخوش کرتا ہے
کچھ لوگوں کے نزدیک وہ بالکل غیر مہذب، ناشائستہ
اور   ہے گمران
مختلف آراء کے باوجود اس حقیقت کا اعتراف
سب کرتے ہیں کہ وہ ایک طباع اور خلاق ذہن کا
مالک ہے۔ اور بلا کا ذہین، ندا کی ذہانت ایک خدا
داد عطیہ ہے۔ جس کی قدر وہ خود کرے نہ کرے

البتہ اس کے احباب و متعلقین ضرور قدر کرتے ہیں
یہ ذہانت لفظوں کا پل سے لے کر آنکھ اور خواب
کے درمیان تک بکھری ہوئی ہے اس کی باتوں
لفظوں، فقروں، جملوں، لطیفوں، شعروں
غزلوں، نظموں اور گیتوں میں ہر جگہ اس ذہانت
کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ لیکن اس ذہانت میں تھوڑا
کرب، تھوڑا تمسخر اور تھوڑی تلخی موجود ہے یہ تلخی
کچھ تو اس کی اپنی فطرت کی پیدا کردہ ہے اور
کچھ وقت اور حالات کے دین ہے۔ جس کا
اعتراف وہ خود بھی کرتا ہے۔

دنیا نہ جیت پاؤ تو ہارو نہ آپ کو
تھوڑی بہت تو ذہن میں ناراضگی رہے

لیکن یہ عجیب سی بات ہے کہ یہ ناراضگی ایک
خول ہے ایک نقاب ہے ایک دکھاوا ہے وہ بظاہر
کڑوا مگر حقیقتاً ایک انسان اور دل ملے یا نہ ملے
ہاتھ ملاتے رہنے کی تبلیغ ضرور کرتا ہے۔ لیکن خود کسی
سے بغیر دل ملے ہاتھ ملانے کو تیار نہیں۔ بلکہ جس سے
اور جب تک ملتا ہے۔ دل ہی سے ملنے کا قائل ہے
رسم دنیا نبھانے کے لئے رشتوں کی تجارت کرنا
اس کو قطعی پسند نہیں یہ اور بات ہے کہ وہ ملاقات

کی یکسانیت سے بہت جلد اوب جاتا ہے اور
نقشہ اٹھا کر نیا شہر ڈھونڈنے لگتا ہے۔ ہر لحظہ
نیا طور نئی برقِ تجلی اس کا شیوہ ہے۔ زندگی کے
تئیں ندا کے اسی رویہ نے اس کی شاعری میں
جدت طرازی کو جنم دیا ہے۔ وہ اچھوتے اور نئے
موضوعات کی دھن میں سیاست، مذہب، سماجیات
فلسفہ اور نفسیات تک کے میدانوں کی سیر
کرتا ہے۔ اور آخرکار اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ؎

ذہانتوں کو کہاں کرب سے فرار ملا
جسے نگاہ ملی اس کو انتظار ملا

ندا کی یہ منتظر نگاہ اس تیسری آنکھ کی حیثیت
رکھتی ہے جو جوگی بن کر جنگل جنگل بستی بستی حقیقتوں
کی تلاش میں نکل پڑتی ہے اور وہ تمام مناظر دیکھ
لیتی ہے جن پر سائنٹفک تکلفات اور تہذیبی و
ثقافتی روایات نے دبیز پردے ڈال رکھے ہیں یہ
کیفیت ایک ایسے خواب زار میں لے جاتی ہے
جہاں ندا کو اس سکون کا احساس ہوتا ہے
جو بدھ کو گیا کے درخت کے نیچے اس وقت ہوا تھا
جب وہ دنیا تیاگ کر گھر سے چلا گیا تھا۔ ایک گریز
زندگی سے فرار اور تجرد کا میدان مگر بہت جلد
آنکھ اور خواب کے درمیان کا یہ فاصلہ ندا کو اس
حقیقت سے روشناس کرا دیتا ہے کہ تجرد عرفان
کی منزل نہیں۔ اس راہ کا ایک چھوٹا سا مرحلہ ہے
زیادہ زیادہ سنگِ میل ہے عرفان اور گیان تک
پہنچنے کے لئے خود آگہی اور خدا آگہی ہی کافی نہیں
آدم آگہی اور عالم آگہی بھی ضروری ہے جس کا مرکز
گھر ہے۔ ندا کو احساس ہوتا ہے کہ گھر میں رہنے
کی عبادت گھر چھوڑ کر جانے سے کہیں بڑی ہے
اس لے وہ فیصلہ کرتا ہے کہ

اپنا غم لے کے کہیں اور نہ جایا جائے
گھر میں بکھری ہوئی چیزوں کو سنوارا جائے

ندا کی شاعری میں گھر کو زبردست اہمیت
حاصل ہے۔ غزلیں ہوں، گیت ہوں یا نظمیں ہر جگہ
ندا ایک گھر کا خواب دیکھتا ہے ایک گھر۔۔۔۔
جو صرف سجی ہوئی دیواروں۔ ٹی۔ وی، فرج، صوفے
سے ہی عبارت نہیں۔ بلکہ لبوں کے خم۔ جھکی آنکھوں
کی بولتی تصویر، بہن کی شوخی، ماں کے پیار
کا درپن، بھیگے دوپٹوں، مہندی کے بوٹوں اور
شاخوں پر پھول کی طرح کھلے ہوئے بچوں سے
مزین ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بنجارہ مزاج ندا کے

اندر کہیں ایک گرہست موجود ہے جو ایک گھر کے ساتھ ساتھ اچھی سی گرہستن کا خواہشمند ہے ایک ایسی گرہستن جو اپنے گرہست زندگی کے سارے رشتوں کے ساتھ ایسے بن لیتی ہے جیسے ریشم کا کیڑا اپنے لعاب دہن سے خود اپنی محافظت کیلئے ایک خول بناتا ہے۔ جس کے اندر وہ ساری دنیا سے چھپ کر رہتا ہے اور جب چاہتا ہے اس میں سے جھانکر دنیا کو دیکھ لیتا ہے۔ یہ گھر ندا کی پوری شاعری میں موجود ہے۔ بلکہ اس کے ہر احساس کے پیچھے اس گھر کی پرچھائیں ملے گی۔ مختلف رنگ لیے۔ قدم قدم پر یہ گھر اسے اپنے پاس بلاتا ہے۔ آواز دیتا ہے

کس سے پوچھوں کہ کہاں گم ہوں کئی برسوں سے
ہر جگہ ڈھونڈھتا پھرتا ہے مجھے گھر میرا

ہم میں کچھ اپنے لئے گھر میں رہانے کے لئے
گھر سے باہر کی فضا مسے ہنسانے کیلئے

اس کو رخصت تو کیا تھا مجھے معلوم نہ تھا
سارا گھر لے گیا گھر چھوڑ کے جانے والا

گھر کی دہلیز سے گیہوں کے کھیت تک
چلتا پھرتا کوئی کاروبار آدمی

چاند میں کیسے ہوئی قید کسی گھر کی خوشی؛ یہ کہانی کسی مسجد کی اذاں سے سنیے

ندا کے یہ تمام اشعار پڑھیے تو ہندوستان کے اس گھر کی کہانی ہماری سمجھ میں آجاتی ہے جس گھر کی دیوار زینت کے لئے ہر مرد دہلیز سے گیہوں کے کھیت تک کا سفر کرتا ہے۔ اور یوں گھر کی دیواریں ہی اس اس کا گھر چھین لیتی ہیں۔ اور ہر گھڑی بھاگتے رہنا اس کا مقدر بن جاتا ہے ندا بھی اس گھر کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ لیکن شاید اسے گھر پہنچنے میں دیر ہوگئی اور دیر ہو جانے پر کھویا ہوا آسمان کا ستارا بن گیا جو دور سے بلاتا تو ہے لیکن پاس نہیں آتا۔

تم جو سوچو وہ تم جانو ہم تو اپنی کہتے ہیں
دیر نہ کرنا گھر آنے میں ورنہ گھر کھو جائیگے

بنجارہ مزاجی کے تمام نشے ٹوٹنے کے بعد ندا اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ساری دنیا انسان کا گھر ہے انسان جہاں بھی رہتا ہے، اپنے ہی گھر میں رہتا ہے وہ چاہے دنیا بھر میں رہے اس کا گھر اُسے واپس بلا ہی لیتا ہے یہ ایسی حقیقت ہے جسے آج کا سائنس گزیدہ ناآسودہ فرد مشکل ہی سے سمجھ پاتا ہے

تم جہاں بھی رہو
اسے گھر کی طرح سجاتے رہو
گملوں میں پھول لگاتے رہو

دیواروں پر رنگ چڑھاتے رہو

بچے بنے گھر میں

ہاتھ پاؤں اُگ آتے ہیں

پھر تم کہیں جاؤ

بھلے ہی اپنے آپ کو بھول جاؤ

تمہارا گھر

تمہیں ڈھونڈھ کر واپس لے آئے گا

یہ گھر جو ایک فرد کو ڈھونڈھ کر واپس لے آتا ہے

دراصل وہی اُسے رشتوں کی ڈور سے باندھتا ہے

وہ مستحکم اور پاکیزہ رشتے جو جسموں سے روحوں تک

پھیلے ہوئے ہیں اور سارے عالم کو منتشر ہونے سے

بچاتے ہیں۔ حقیقت اور مجاز کے مابین خدا اور

بندے کے بیچ آنکھ اور خواب کے درمیان بھی

تو ہیں جو کائنات کی اور خوفناک سناٹے

کو ایک معنویت اور شیریں شور وغل عطا کرتے ہیں

رشتوں کا یہ چکر ہی زندگی کی خوشبو اور سچائیوں

کا ضامن ہے۔ لہٰذا ان بنتے بگڑتے ٹوٹتے جڑتے

رشتوں کا سچا قدر داں ہے اور ان حقیقتوں کا

عرفان رکھتا ہے

یہ میرا تمہارا

جو رشتہ ہے

ایک راستہ ہے

میں تم سے گزر کر ہی

تم تک پہنچنے کی رفتار ہوں

میرا آغاز تم

میرا انجام تم

تمہیں دیکھ کر میں تمہیں سوچتا ہوں

تمہیں پا کے ہی

میں تمہیں کھوجتا ہوں

تم اپنے بدن کے سمندر میں

صدیوں سے پوشیدہ

ایک خواب ہو

اور میں

خون کی تیز گردش میں ہنستی ہوئی آنکھ ہوں

ان رشتوں کی سچائی کا جیتا جاگتا روپ

انسان کی معصومیت ہے جو کسی بچے کی شکل میں مسکراتی

ہے۔ بچہ جو سچائی ہے لہٰذا اس بچے کی تلاش میں سجدوں

مندروں، بے چراغ گلیوں، ساحلوں اور چاند ستاروں

تک پہنچتا ہے

مسجد و منبر سجدوں کی مشعلیں ہوں مرے دوش پہ بے چراغ گلیوں میں کھیلتا خدا دیکھوں

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

اے شام کے فرشتو! ذرا دیکھ کے چلو
بچوں نے ساحلوں پہ گھروندے بنائے ہیں

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو
چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں گے

ندا کو اپنے آس پاس اس بچے کی کمی اس وقت بھی محسوس ہوتی ہے جب رخصت ہوتے وقت اس کی چھوٹی بہن اٹیچی میں کپڑوں کے نیچے چپکے سے اپنے بچوں کی تصویر رکھ دیتی ہے اور ایرپورٹ پر اٹیچی کھولنے پر جب یہ تصویر ندا آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے تو اس کے احساس میں دور دور تک ایک عجیب سی اتھل پتھل ہوتی ہے یہ خیال اسے چین نہیں لینے دیتا کہ چھوٹی بہن بھی اس نے ماں کی طرح دعا دی ہے۔ یہ انسانی زندگی کی ایک ایسی سچائی ہے۔ جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاید اس نظم کے اندر وہ معصوم خواہش دبی ہوئی ہے جو گھر اور گرہستی کے خوابوں میں گھرے ہوئے ایک لاابالی نا آسودہ شاعر کے دل کی پکار ہے جو زندگی کی اذیتوں سے برسرِ پیکار ہے۔ اور گھر کی صدا پر لبیک کہہ کے لوٹنا چاہتے ہوئے بھی لوٹ نہیں پاتا

گھر، بچہ اور رشتوں کے درد کے علاوہ بھی ندا کی غزلوں کے کچھ اور موضوعات ہیں مثلاً شہری زندگی کا کرب، جو وہ خود برسوں سے جھیل رہا ہے ذات کی شکست و ریخت کا احساس اور جھنجھلاہٹ، محبت اور اس کی ناکامی کے سماجی و معاشی اسباب و علل عہدِ حاضر کی خود غرضی اور مطلب پرستی، دوسرے کو گرا کر خود آگے بڑھنے کی روش، انسانیت و امن پسندی کے خواب اور ان کا انتشار وغیرہ وغیرہ — ملاحظہ ہو

اپنی طرح سبھی کو کسی کی تلاش تھی
ہم جس کے بھی قریب رہے دور ہی رہے

یہ شہر ہے کہ نمائش لگی ہوئی ہے کہیں
جو آدمی بھی ملا بن کے اشتہار ملا

شہر میں سب کو کہاں ملتی ہے رونے کی جگہ
اپنی عزت بھی یہاں ہنسنے ہنسانے سے رہی

میرے تیرے چولھوں میں تو اتنی آگ نہیں تھی
جس سے سارا شہر جلا ہے کوئی پرچم ہوگا

"آنکھ اور خواب" کے درمیان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک حصہ گیتوں کا ہے دوسرا غزلوں کا تیسرا نظموں کا۔ اور اس میں ندا کا ذہنی سفر بھی منزل

یہ منزل آگے بڑھتا ہے۔ ندا کے گیتوں میں دھرتی کی بوباس ہے۔ گاؤں کی زندگی کا حسن ہے موسموں کی دلکشی ہے۔ جذبات کی معصومیت ہے اور وہ ترشح ہے جو پہلی بارش کے بعد زمین کو مہکا دیتا ہے ان گیتوں کے پڑھنے سے ایک احساس جاگتا ہے جیسے جاڑوں کا موسم ہے اور دور کہیں ہلکے ہلکے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ یا ساون کا مہینہ ہے۔ آسماں پر بدلیاں چھائی ہوئی ہیں۔ اور ہلکی ہلکی رم جھم کھیتوں اور کھلیانوں کو شاداب کر رہی ہے۔ آموں کے پیڑوں پر کوکتی ہوئی کوئل کے نغموں جیسے گیت ہیں۔ ندا تصورات ابھرتے ہیں۔ مجرد عکس بناتے ہیں اور ان عکسوں کے گڈمڈ ہو جانے سے کئی سمعی بصری اور لمسی پیکر جنم لیتے خوبصورت اور دلکش پیکر مثلاً ہاتھ میں آگ لیے بیچ ندی میں نہاتی ہوئی رات۔ تتلی کے اڑتے رنگوں میں جھولا ڈالنے والا ساون، برکھا کے ہاتھوں سے دھلی ہوئی، پیڑوں میں چھپ چھپ کے اودھم مچاتی ہوئی ہوائیں، انگوٹھا دکھاتا ہوا مہندی کا بوٹا۔ آنچل سے منہ ڈھک کے سوئی ہوئی دوپہری وغیرہ۔ ہندوستان کے دیہاتوں کی ساری رومانی دلکشی ان گیتوں میں سما گئی ہے

ندا کی غزلوں میں یہ غنائیت نہیں ملتی۔ انہیں تلخی ہے ترشی ہے، طنز ہے کرب ہے۔ بے رحمی ہے جھنجھلاہٹ ہے، تشدد ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ندا کے گیتوں کا گاؤں اس کی غزلوں میں کہیں گم ہو جاتا ہے وہاں صرف شہر ہے۔ شہر کی بھاگتی ہوئی زندگی، بھاگتے ہوئے لوگ، دوڑتی ہوئی کاریں، نقابوں میں چھپے ہوئے چہرے تکلفات سے بھرپور تعلقات، جذبات کی جھوٹی نمائشیں اور ریاکاریاں اور مکروہ سیاستیں ملتی ہیں۔

نظموں تک آتے آتے ندا کا ذہنی سفر اور آگے بڑھتا ہے۔ اب اس کی نظر نہ صرف اپنے گاؤں پر ہے۔ محض شہر تک اس کی نگاہ محدود ہے۔ ندا کی آنکھ اب سارے عالم کی سیر کرتی ہے اور اس وسعت نظر کے لئے غزل کا تنگ تانا کافی نہیں ہوتا آبگینہ تندی صہبا سے پگھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لہٰذا ندا نظموں کے فارم کا سہارا لیتا ہے۔ نظمیں جو آزاد بھی ہیں۔ اور نثری بھی۔ ان میں وہ اپنے خیالات کو آزادانہ طور پر پیش کر سکتا ہے۔ ندا کی نظموں میں دنیا ملتی ہے عالمی انتشار ملتا ہے اس سرے سے اس سرے تک پھیلی ہوئی سیاست اقتدار کی جنگ ایٹمی

بلاؤں کا نزول، سائنٹیفک ترقی کی کوششیں اور
زحمتیں، سماجی تصویریں، فلسفے کی موشگافیاں
نفسیاتی ادھیڑبن، امن و انسانیت کی ظاہری
باتیں، جنگ کی تباہ کاریاں وغیرہ۔

ان میں کچھ نظمیں ایسی ہیں جو خالص رومانی
کہلائی جا سکتی ہے مثلاً وقت سے پہلے، ایک خط
شکایت، بے خبری، فاصلہ، دیوانگی رہے باقی
انتظار اور سمجھوتہ وغیرہ۔ ان میں بعض جگہ نفسیات
کی بڑی دلکش تصویریں ملتی ہیں۔ مثلاً حسن کی
نفسیات۔ لیکن ان نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ
عشق و محبت کے بارے میں بھی ندا کا رویہ عام انداز
سے ہٹ کر ہے اس محبت بیمار نہیں بلکہ صحت مند
جذبات کی حامل ہے وہ ہر حقیقت کو خندہ پیشانی
سے قبول کرنے کو تیار ہے۔

فقط ایک تم ہی نہیں ہو
یہاں جو بھی اپنی طرح سوچتا ہے
زمانے کی نیرنگیوں سے خفا ہے
ہر ایک زندگی ایک نیا تجربہ ہے
تمہاری شکایت بجا ہے
مگر تم سے پہلے بھی
دنیا یہی تھی
یہی آج بھی ہے
یہی کل بھی ہوگی

کچھ نظمیں سماجی موضوعات سمیٹے ہوئے ہیں مثلاً
نئے گھر کی پہلی نظم، گلاب کا پھول، پیسے کا سفر
سماجی شعور، لگاؤ، کامیاب آدمی، محبت کا تماشا
سونے سے پہلے وغیرہ۔ کچھ نظموں میں ندا کا انداز
فلسفیانہ ہے مثلاً جسم کی جستجو، کھلونے۔ فاتحہ
اتفاق، سچائی، علاج وغیرہ، عمر کا فرق، جنریشن
گیپ پر ایک خوبصورت نظم ہے۔ اس مجموعے کی
بہترین نظمیں وہ ہیں جو عالمی موضوعات کا احاطہ
کرتی ہیں۔ مثلاً انتقام (قہار)، خدا کا گھر نہیں کوئی
فیصلہ، جنگ، قومی یکجہتی، پرانے کھیل، شرط
وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام غزلوں، نظموں اور گیتوں سے گزرنے
کے بعد ایک ایسے شاعر کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے
جو ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ حساس بھی ہے اور
اور دل درد مند بھی رکھتا ہے اسی احساس نے اس
کے لفظوں میں تلخی اور تندی پیدا کر دی ہے مگر لہجے کی
شاعرانہ دلکشی اسے مجروح ہونے نہیں دیتی۔ آنکھ اور

- بقیہ صفحہ ۱۲۱ پر
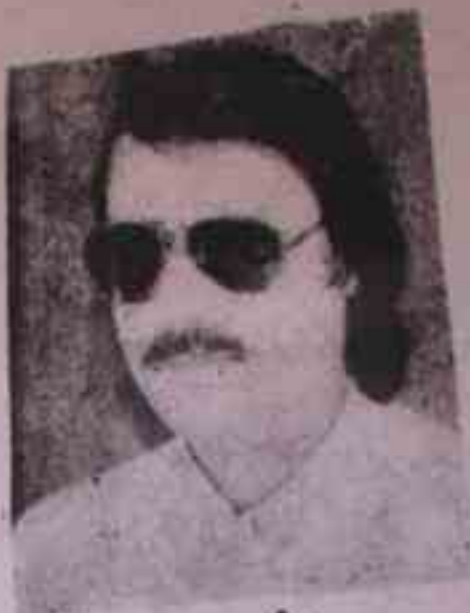
ڈاکٹر رفعت اختر

ندا کا شعری اسلوب

ترقی پسند تحریک کو جدیدیت کا اعتبار تسلیم کرنے والوں میں ندا فاضلی کا نام بھی سرفہرست ہے ان کے لہجہ کی اپنی انفرادیت ہے۔ خاص طور پر عام لفظ کا تخلیقی استعمال ندا کے اسلوب کی پہچان ہے

یہ حقیقت ہے کہ آج تک اسلوب کی کوئی جامع تعریف سامنے نہیں آئی۔ پروفیسر سے لے کر بوفان تک، کارلائل سے امرسن تک سب ہی اسٹائل کی تعریف بیان کرنے میں اس بات سے متفق ہیں کہ اسٹائل شخصیت کا اظہار، اظہار کی تکنیک اور اظہار کی انفرادیت کا نام ہے ایمرسن کے نزدیک اسلوب فنکار کے ذہن کی زبان ہے۔ بعض لونجائنس اسلوب کی رفعت کو ایک بڑی شخصیت کی گونج کہتا ہے یہ حقیقت ہے کہ اسلوب انفرادیت سے عبارت ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کا ظہور ہمیشہ منفرد طریقہ سے ہوتا ہے۔ ہر عہد میں ذہنی رویہ اور تصورات تبدیل ہوتے ہیں۔ تصورات کی تبدیلی کے ساتھ زندگی کا عام طرز عمل بھی بدل جاتا ہے۔ لہٰذا ادب اور تہذیب و تمدن میں تبدیلی بھی لازمی امر ہے۔ بقول کارلائل اسلوب کسی ادیب یا شاعر کا کوٹ ہی نہیں ہے۔ کہ جب چاہا اتار دیا اور جب چاہا پہن لیا یہ انسان کی جلد ہے۔ ہر بڑے شاعر کی اپنی محفل ہوتی ہے جہاں لفظوں، فقروں ترکیبوں اور جملوں کو مہذب کیا جاتا ہے۔ ندا فاضلی نے بھی اس تہذیب اور اس تہذیب کے آداب اور طور طریق کو اسلوب کا جامہ پہنایا ہے۔ سنہ ۱۹۶۰ کے بعد اردو میں بہت کم شعرا ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے اسلوب کی پہچان قائم کی ہے۔ ندا فاضلی کا نام بھی سرفہرست ہے۔ ندا کی شاعری ناف سے اوپر یا ناف سے نیچے کی شاعری نہیں بلکہ جدید حیثیت کی شاعری ہے جس میں ہندوستانی دیومالا، اساطیر، ہجر و وصل ذات و کائنات اور امکانات و مستقبل کے زندہ پیکر بدرجہ اتم

موجود ہیں۔ ان کا شعری اسلوب قاری کو چونکا دینے والا ہے اور فکر میں بھی مبتلا کر دیتا ہے۔

ندا بنیادی طور پر شہر اور متوسط طبقہ کا شاعر ہے۔ انہوں نے زندگی کے مصائب کو بڑی خوش دلی سے اور بہادری سے مقابلہ کیا ہے

اردو شاعری میں قومی یکجہتی کا تصور رحیم نظیر، نسیم اقبال، جگن ناتھ آزاد، غالب، ساگر رام، آنند نارائن، ملا، خواجہ احمد فاروقی، حالی، اور ساقی فاروقی وغیرہ کو جوڑ کر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن طوائف کا قومی یکجہتی کا علمبردار بنانا صرف اور صرف ندا فاضلی کا حصہ ہے۔

اُن کی نظم ملاحظہ ہو۔ جیسی ندا فاضلی طوائف علامت سے قومی یکجہتی کا پرچار اس طرح کرتے ہیں

وہ طوائف
کئی مردوں کو پہچانتی ہے
شاید اس لئے دنیا کو جانتی ہے
اس کے کمرے میں
ہر مذہب کے بھگوان کی ایک تصویر لٹکی ہے
یہ تصویریں
لیڈروں کی تقریروں کی طرح نمائشی نہیں

اُن کا دروازہ
رات گئے تک
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی،
ہر ذات کے آدمی کے لیے کھلا رہتا ہے
خدا جانے
اس کے کمرے کی سی کشادگی
مسجد اور مندر کے آنگنوں میں کب پیدا ہوگی

اردو زبان یقیناً ایک سیکولر زبان ہے اور اردو ادب قومی یکجہتی کا علمبردار۔ اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی ضرورت نہیں۔ اس کا درس ندا کا شاعری ہے

ان کی ایک اور نظم "والد کی وفات پر" ایک ایسی نظم ہے جو "نظم والدہ مرحومہ کی یاد" ہی کی یاد تازہ کراتی ہے اگر ندا نے اس نظم کے علاوہ شاعری نہیں کی ہوتی تو شاید وہ صرف اسی نظم کی وجہ سے اردو شاعری میں زندہ و پائندہ رہ سکتے تھے۔

تمہاری قبر پر۔ میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا۔ تم مر نہیں سکتے۔ ....
تمہارے ہاتھ میری انگلیوں میں سانس لیتے ہیں

...... میری آواز میں چھپ کر۔ تمہارا ذہن رہتا ہے۔...... میری بیماریوں میں تم۔ میری لاچاریوں تم۔ تمہاری قبر پر جس نے تمہارا نام لکھا ہے۔ وہ جھوٹا ہے۔ تمہاری قبر میں میں زندہ ہوں۔.... تم مجھ میں زندہ ہو۔.... کبھی فرصت ملے تو فاتحہ پڑھنے چلے آنا۔......

ندا کی نظم "والد کی وفات پر" کی تعلق سے بھی ایک شاہکار نظم ہے۔

عام بول چال کو زبان کو تخلیقی زبان بنانے میں ندا کو ملکہ حاصل ہے۔ پھول، تتلی، شام، بھنورا دھوپ، سایہ، سورج، ہجر، وصل منظر، صوفہ، فرج، چھت، کوٹھا برسات، دوست، دشمن، شہر، ذات، کائنات ذہنی پیکر مثلاً سمعی پیکر روشنی، شفق، افق، طوائف، کردار قربتی، فرقتی، نور مجسد، رقیب اور محبوب وغیرہ جیسی لفظیات کو ذہنی تلازمات بنا کر تخلیق بنا دینا ندا کا شعری اسلوب ہے

ندا کی شاعری نئی جمالیات کی تشکیل کرتی ہے مثلاً

بدن کے پیڑ کو کاٹے گی خود اسی کی شاخ
یہی تراش زمیں کو نیا شجر دیگا

ندا کے یہاں درد و غم کی ایک مسلسل لہر ملتی ہے جو کبھی بڑھتی اور کبھی گھٹتی رہتی ہے مثلاً

اپنا غم لے کے کہیں اور نہ جایا جائے
گھر میں بکھری ہوئی چیزوں کو سجایا جائے
گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

ندا کی شاعری میں پیکر نگاری اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ کسی ازم کے قائل نہیں ہیں۔ خواہ وہ وادا ازم ہو یا فیوچرزم، کیوبزم ہو یا ماڈرنزم ریلزم ہو یا سرئیلزم، وجودیت یا مارکزم، سائرازم خصوصاً ان کی شاعری کا منفرد اسلوب ہے

ندا کی نظمیں۔ اقبال، فیضی، جوش کی نظموں کی تابناکی سے بھی سبقت لے گئی ہیں۔ ان کی نظم شکوہ، استعارہ، گلاب کا پھول، اگرچہ اقبال فیضی، اور جوش کی نظموں کی یاد تازہ کراتی ہیں لیکن آج کا قاری ندا کی نظموں سے زیادہ لطف اور تلذذ حاصل کرتا ہے۔

ندا کے وجود کا کرب ایک ایسا کرب ہے جیسے

آفاقی حیثیت ہے۔ اُن کی شاعری ذات سے
شروع ہو کر کائنات کا سفر طے کرتی ہوئی ذات کے
حصار میں مقید ہو جاتی ہے نتیجتاً آج کے دور میں
ذہانت کو چھپائے رکھنے کی تلقین کرتی ہے۔ ندا بنیادی
طور پر "کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے" وہ
قائل نظر آتے ہیں چنانچہ اُن کی شاعری میں غزل کے
ساتھ دوہے۔ گیت اور جدید نظم کے تجربے بکثرت
موجود ہیں۔ ندا کے گیتوں میں غزل کا لطف اور
نظموں میں مختصر نظم کا سا ارتکاز نظر آتا ہے ایک
نظم ہی خدا کی قہاری کو شکل عطا کرتے ہوئے
کہتے ہیں کہ

مسجدوں مندروں کی دنیا میں
مجھ کو پہچانتے ہیں کہاں ہیں لوگ
روز میں چاند بن کے آتا ہوں
دن میں سورج سا چمکتا ہوں
کھنکھناتا ہوں ماں کے گہنوں میں
ہنستا رہتا ہوں چھپ کے بہنوں میں
میں ہی مزدور کے پسینے میں
میں ہی برسات کے مہینے میں
میری تصویر آنکھ کا آنسو، میری تحریر جسم کا جادو
مسجدوں مندروں کی دنیا میں
مجھ کو پہچانتے نہیں جب لوگ
میں!
زمینوں کو بے منیا کر کے
آسمانوں میں لوٹ جاتا ہوں
میں خدا بن کے قہر ڈھاتا ہوں

اس نظم میں علامت نگاری کے ساتھ ساتھ
ریلیزم (حقیقت نگاری) اور پیکر نگاری گڈمڈ
ہوتی نظر آتی ہیں۔ جو ندا کے ذہنی تلازمات
اور اسلوب کی پہچان ہے
ندا کے گیت نگاری میں ہندوستانی دیومالا
اور اساطیر کے ساتھ ساتھ نئی شعری لفظیات
کی آنچ بھی موجود ہے۔ ایک گیت میں جنگلوں کو
بنجاروں کا بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ

جنگل بنجاروں کے
تتلی کے اڑتے رنگوں میں
ساون جھولا ڈالے
ہوا اکیلی رستہ بھولے
جگنو دیپک بالے
بیچ میں انکر

بن کر پھوئیں
خاموشی کے گیت
جنگل بنجاروں کے

ندا نے اردو گیتوں میں صرف ماضی اور ہی بیان نہیں کیا ہے بلکہ بنجاروں کو بھی گیت میں بیان کر کے گیت کی وسعت کو ثابت کیا ہے تتلی کے اڑنے رنگوں میں ساون کا جھولنا جیسی اردو شاعری میں ندا ہی کی دین ہے ادب کے قاری کے ذہن میں ندا کا اسلوب اس طرح رچ بس گیا ہے کہ ندا کی شاعری کو پہچاننے میں کسی کو قباحت نہیں ہوتی۔ ندا کی یہ خوبی انھیں نہ صرف اپنے ہم عصروں سے ممتاز کراتی ہے بلکہ آفاقی اور دوامی شہرت کی طرف بڑھ رہی ہے —

خارِ ہزار دشت
شاعر حرفی
جاوید پبلی کیشنز جامع مسجد کے پاس
مارڈ سٹی یووھپور

لازوال کیفیات
کی
بے مثال عکاسی
نعمان شوق
کا
اولین شعری مجموعہ
اجنبی ساعتوں کے درمیان
عنقریب منظر عام پر آرہا ہے
رابطہ:- شاکر میگزین کارنر گلی محلہ آرا
۸۰۲۳۰۱
ناشر:- تخلیق کار پبلشرز ۱۰۴، فراش خانہ دہلی ۶

زندگی اے زندگی کے بعد

اردو کے مشہور شاعر

سید شکیل دسنوی کا دوسرا شعری مجموعہ

تنہا تنہا

اردو کے ساتھ ساتھ

اب دیوناگری میں بھی

تنہا تنہا

قیمت —— چالیس روپیہ -/۴۰

ملنے کے پتے

(۱) مکتبہ جامعہ دہلی

(۲) ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ نئی دہلی

(۳) حسن منزل اڑیہ بازار کٹک اڑیسہ

ندا فاضلی کے گیت

پریمی رومانی

گیت ہندی شاعری کی دین ہے اردو شاعری میں جس طرح کی گداختگی، خوبصورتی، نرماہٹ اور شیرینی کا احساس غزل میں ہوتا ہے۔ ہندی گیت ایسی ہی چند خصوصیات کا حامل ہے اردو میں گیت نگاری کا آغاز کہاں کیسے اور کب ہوا یہ ہماری بحث سے اس وقت خارج ہے البتہ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو میں گیت ہندی کے اثر سے پیدا ہوا۔ بعض لوگ اردو گیت کے ڈانڈے دلی سے لے کر نظیر اکبرآبادی تک مختلف شاعروں کے کلام سے ملاتے ہیں۔ زبیر رضوی لکھتے ہیں کہ ہندی گیتوں کی لے پہلی بار اردو میں نظیر اکبرآبادی کے یہاں سنائی دیتی ہے۔ مجھے ان کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اردو شاعری میں گیت وا ضح نقوش پہلی بار امانت لکھنوی کے ڈراما اندر سبھا میں ملتے ہیں۔ بیسویں صدی میں ن۔م۔ راشد میراجی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، مقبول احمد پوری عبدالحمید عدم، قتیل شفائی، شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، اسلام مچھلی شہری، مجروح سلطانپوری بیکل اتساہی، تاج سعید، مجید امجد، تنویر نقوی اکرم افکار وغیرہ نے اس صنف کو آگے بڑھایا حالیہ برسوں میں زبیر رضوی، منیر نیازی، ناصر شہزاد کرشن موہن، کمل کرشن اشک وغیرہ نے بہت اچھے گیت لکھے۔ اور اس صنف کو ایک مستقل صنف بنانے کی کوشش کی۔ ان ہی گیت کاروں میں ندا فاضلی کا نام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

ندا فاضلی شروع سے ہی ایک شاعرانہ ذہن لے کر آئے تھے۔ ان کی ذاتی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ خارزاروں سے گذرے ہیں۔ اور زندگی کے شدائد کا مقابلہ مسلسل کرتے آئے ہیں۔ ان کی وجہ سے ان کے کلام میں عجیب گداختگی، درد تڑپ کا احساس ہوتا ہے۔ شاید اسی رنج والم کے شدید احساس کا ردعمل ہے کہ انہوں نے گیتوں کیطرف رجوع کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ زندگی سے لڑنے کا

سب سے آسان اور دلکش طریقہ شاعری ہے ندا
فاضلی گاؤں کی فضا میں پلے بڑھے ہیں اور اس کے
ماحول اور زندگی سے واقف ہیں۔ اس کے بعد
جب وہ شہر کی مشینی زندگی سے متصادم ہوئے
تو ان کے ذہن کے عجیب انتشار کا تجربہ حاصل کیا
اسی لئے ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف
اپنی گم شدہ شناخت کی بے معنی تلاش کا کرب
ملتا ہے۔ وہاں دوسری طرف مشینی زندگی کے
مسائل کا سامنا کرتے ہوئے بھی وہ خوابوں میں
بسے ہوئے شاداب و سرسبز گاؤں کی حسین
یادوں میں پناہ لینا چاہتے۔ ان کے خواب بکھر
بکھر جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کا ایک اہم موضوع
انسانی تناؤ ہے جو مشینی قوتوں کے دباؤ اور خاص
طور پر جنسی زندگی کی گھٹن سے پیدا ہوا ہے وہ اپنے طبقہ
کے لوگوں کے دبے ہوئے جنسی اور نفسیاتی کیفیات
کے پیش کرنے کے دوا ہیں۔ ان کا موضوع جنس رہا ہے
اسی لئے ان کے گیتوں میں عام طور پر اسی کیفیت
کی بازیافت ملتی ہے۔ جنس کو وہ دراصل وہ ایک
علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ
زندگی کے دبے ہوئے ناسوروں اور مجروح
خوابوں کو جنس کا موضوع بنا کر سامنے رکھتے ہیں
ندا فاضلی کامیاب رومانی شاعر ہیں۔ وہ جنسی
مسائل پر بھی نہایت سنجیدگی سے سوچتے ہیں۔ اور
اس کو کامیابی کے ساتھ اپنے گیتوں میں اس طرح
برتتے ہیں کہ اس کا زیر و بم اور سے نرماہٹ روح
کو گرماتی ہے۔ مثلاً ؎

پتھر پتھر پانی چھنے
ریت بنی جل دھارا
گونگے بہرے سنائے
میں چیخ چیخ کر ہارا
اتر، دکھن، پورب، پچھم
ہوا کرے من مانی
پانی دے او پانی

یا

یہ سمے بڑا ہرجائی
سمے سے کون لڑے بھائی
راجہ سینا لے کر گھوڑے نگر نگر ہو آئے
جس ماٹی کو جیتے سو رکھا اس میں ہی کھو جائے
نہ آئے کام کوئی چترائی
سمے سے کون لڑے بھائی

ندا فاضلی کے گیتوں میں رنگین تشبیہات رومانی
کیفیات اور وجد آمیز امیجری ملتی ہے۔ ان کا مطالعہ
کرتے ہوئے تمام پرپیچ راہیں خود بخود کھلتی ہوئی نظر
آتی ہیں۔ ان کے ہم عصر شعرا میں ایسی تشبیہات
واستعارات شاذ ہی نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے اشعار
میں مصوری کرتے ہیں۔ ان کے گیت پڑھ کر ایسا
لگتا ہے جیسے خود بخود روح کی پیاس بجھ رہی ہو
بیلوں کی شیشہ آنکھیں، دھرتی کی چھاتی
جل دھارا، گونگے بہرے سناٹے۔ ریت ہی
جل دھارا، آنگن آنگن جلتی جوالا، ننگے سارے بول
وغیرہ جیسی ترکیبات استعمال کر کے وہ ایک نئی دنیا
آباد کرتے ہیں۔ اپنے مخصوص سیاق و سباق میں
ان تراکیب کا استعمال اس قدر مصورانہ ہے کہ
حسین رنگوں کے آمیزش سے بنی ہوئی خوبصورت
اور پرشکوہ تصویریں گھومتی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں
یہ خصوصیت اردو کے بہت کم گیتوں میں ملتی ہیں
مثلاً بیلوں کی شیشہ آنکھوں میں

تھر تھر بادل
کٹی پھٹی دھرتی کی چھاتی
دور دور تک جنگل

پربت پربت وادی وادی
ویرانی ویرانی
پیاس بڑی دیوانی
لوہارن — لوہے کو پیٹے
لگے ہتھوڑا سن پر
بڑھئی بیچارہ — لکڑی چیکر
میں دیکھوں اٹھ اٹھ کر
نئی صراحی میں بھی پانی
ندیا جیسا ہے
جب سے تم پردیس گئے ہو

ندا فاضلی نے اردو گیت کو ایک نئے آہنگ
اور معنویت سے آشنا کیا ہے۔ اُن کا کمال یہ ہے
کہ وہ گیت میں مشینی دور سے لگتی زبان اور لہجے
سے کام لیتے ہیں۔ ان کا لہجہ نرم، کومل اور احساسات
سے بھرپور ہیں۔ اس لہجے سے وہ اکثر جگہوں پر
نازک اور انسلاکاتی مفاہیم کو جگاتے ہیں۔ ان کی
زبان فارسیت کے اثر سے آزاد ہے وہ سادہ
آسان اور روزمرہ بولی جانے والی زبان کو تخلیقی
لمس عطا کرتے ہیں۔ ان کا لب و لہجہ سب سے
جداگانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گیتوں میں

عمل اور ردعمل دونوں کیفیات ملتی ہیں۔ ندا فاضلی
اپنے گیتوں میں وقت کا بربط کا سریلا راگ الاپتے ہیں
وہ راگ جس میں محبت کا تاثر بھی ہے۔ محرومی کی کھنک
بھی ہے۔ اور انقلاب کی پکار بھی۔ ان کے گیت
اس انسان کے نازک جذباتی اتار چڑھاؤ کو پیش
کرتے ہیں جو شہروں کی مصروف کاروباری زندگی
میں سانس لینے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ندا فاضلی نے
گیت کینوس میں ایک وسیع دائرے میں زندگی
کی بڑی حقیقتوں کو سمیٹ لیا ہے وہ گیت کے ان
تخلیق کاروں میں سے ہیں جنہوں نے اس صنف
کو مواد ہیئت اور تکنک سے آراستہ کیا ہے اور
اس میں جوش ولولہ اور دلکشی کے علاوہ گداختگی
تڑپ اور نرماہٹ پیدا کی ہے۔ ندا فاضلی کے
گیتوں میں جہاں حسن وعشق رقص ملتا ہے
وجد وجہد حیات کی تڑپ بھی پائی جاتی ہے۔ ان
گیتوں کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ ہر انسان کو
ان میں اپنی دھڑکن سنائی دیتی ہے ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ گویا ان کے اندر کی آواز ہے۔ ان کے گیتوں
میں سنگین پختہ کاری بھی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے
درج ذیل گیت نمونے کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں

ہر منی میں الجھا ریشم
ڈورے بیستر ڈورا
باہر سو گانٹھوں کے تالے
اندر کاغذ کورا
کاجل بشیشہ، پرچم تارا، ہر سوکھے میں کھانا
جیوں شور بھرا سناٹا

٭دیا٭

ڈھلتا سورج ڈھل جائے، چندا رات چرائے
سانسوں کا انمول خزانہ پگ پگ لٹتا جائے
لٹیرا لوٹے ہر انگنائی
ہے سے کون لڑے بھائی

٭دیا٭

ایک روپے کے سولہ آنے
دو آنے کا مول
بھائی بہن - پورب اور پچھم
ماتا پتا بے زار
گھونگھٹ میں سمٹی خاموشی
دو دھاری تلوار
گھر کی لاج کھڑی دروازے
کب سے سانکل کھول

ندا فاضلی کے گیتوں میں علامتی اسلوب ملتا ہے انہوں نے اپنے گیتوں میں سلیس اور رواں زبان، جدید تکنیک اور نئی ہیئت استعمال کی ہے وہاں رمزیت اور اشاریت کے پہلو بھی اجاگر ہوتے ہیں اس کے علاوہ انہوں نے لوک شاعری کا رنگ بھی اس میں بھر دیا ہے۔ جس سے اُن کے گیت زیادہ سریلے خوشبودار اور سدا بہار بن گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی ان کے گیتوں کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

ندا نے زیادہ تر گیتوں کے لئے انہیں نے لوک گیتوں (خاص کر گاؤں) کی دھن اختیار کی ہے جو بہت ہی خوشگوار معلوم ہوتی ہے

ندا فاضلی کے گیتوں میں قاری اپنے دل کی دھڑکن صاف طور پر محسوس کرتا ہے وہ ان کو گنگنانے پر مجبور ہو جاتا ہے ان کے گیتوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے۔ کہ ان کے تراشے ہوئے مصرعوں کی ہم آہنگی اور الفاظ کی مترنم آواز دلوں میں عزم و استقلال کی بے پناہ کیفیت پیدا کرتی ہے۔ ان گیتوں میں لچک اور مدھرتا ہر جگہ ملتی ہے اور ابلاغ کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا وہ اپنے محسوسات قاری تک فوری طور پر پہونچانے میں کامیاب نظر آتے ہیں

استعارات اور تشبیہات پر پوری طرح وہ دسترس رکھتے ہیں۔ اپنے گیتوں میں انہوں نے نئی خوبی اور جذبات کی شدت برقرار رکھی ہے۔ ندا کے اکثر گیتوں میں جہاں تناظر ہے وہاں مشاہدے میں کارفرما خارجی اور داخلی عوامل کا پتہ بھی چل سکتا ہے۔ انکے گیتوں کی انفرادیت اور عظمت کا پورا اندازہ ان کے لہجے اور انداز بیان سے ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

ابھی ابھی تو ٹوٹے گا پیالہ
پھر خود جڑ جائے گا۔
مڑ کر دیکھا تو
گھر کی سریا مڑ جائے گا۔
کبھی آگے.......

؎ بیت گئی رات۔ بندے کا چل کے ڈریے سے
چنچل ہوں۔
کرسی کے ہتھے پہ چائے کی پیالی۔
کھانسی کی گھڑ گھڑ میں ادھ ننگی کالی
چھوٹ گئی ہاتھوں سے پوجا کی تھالی
بیت گئی رات

ندا فاضلی کی رومانیت میں رومانیت کے عنصر کے علاوہ غم کی دھیمی دھیمی آنچ بھی ملتی ہے اسکی

وجہ یہ ہے کہ انہوں اپنی زندگی میں بہت ساری مشکلات اور کٹھنائیوں کا سامنا کر کے دریا دلی کا ثبوت دیا ہے یہ عمل کچھ تو شاعر کے ذاتی کرب سے پیدا ہوا ہے۔ اور کچھ معاشرے کی دُدبتی ہوئی نیا کے دکھ سے۔ اس بات اعتراف خود ندا بھی اپنے ایک خط میں یوں کرتے ہیں

سنہ ۱۹۶۶ء میں گوالیار میں گھر فسادات کی نذر ہو گیا۔ تب سے اکیلا ہوں

اس فساد میں ندا فاضلی کے دل کو کوئی بھی فراموس نہیں کر سکتا ہے۔ ایک طرف ان کا گھر، گرہست، مال و جائیداد فساد کے نذر ہو گیا اور دوسری طرف معصوم بچوں کی مسکراہٹیں، بے گناہ عورتوں کی جوالا مکھی کی طرح پتی ہوئی جوانی اور بے قصور مردوں کے جوان خواب پارہ پارہ ہو گئے تھے۔ سارے علاقے کے لوگوں کی خواب اور امنگیں چھین لے گئے تھے۔ اس تباہ کاری نے ندا فاضلی کے دل پر گہرے اثرات مرتسم کرنا شروع کئے تھے اسی لئے ان کے گیتوں میں تمام ان واقعات کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنے دل کی ان ہی ویرانیوں کا مرثیہ جس فسوں کاری سے کھینچا ہے وہ ان ہی کا کارنامہ ہے۔ ندا فاضلی ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کے گیت دلوں کو مسحور کرنے میں ان کی محبت پاؤں کی جھنکار اور گنگروں کی آواز بھی ہے۔ ان کے علاوہ زندگی کا نیا پیام عمل و عزم کا سبق اور روح کی گہرائیوں کا عکس بھی ملتا ہے۔ الفاظ بالکل جانے پہچانے ہیں۔ جن سے صدیوں کی بے خوابی ٹپکتی ہے۔ اس جادو جگا نے والے اسلوب سے جو محسوسات اور جذبات ابھرتے ہیں۔ ان میں ہمارے کرب، ہمارے معاشرے کا کرب رس رس کر ٹپک پڑتا ہے مثلاً۔

؎ جانے پہچانے ___ انجانے
اپنے اپنے گھاؤ
آنگن آنگن جلتی جوالا
سڑک سڑک
پتھراؤ
شبدوں کے سب چہرے زخمی
ننگے سارے بول

پیا

بیت گئی رات، گھلی ندیا کے پانی میں پہلی کرن
املی سے طوطے نے پینگے گزارے

انگن سے رود ڈیرِ سانجھ سکارے
پتیل کی ٹونٹی سے گرتے ستارے

ندا فاضلی نے اپنے گیتوں میں مرقع کاری کے اچھے اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ انہوں نے نیا علامتی اسلوب اپنا کر ماضی کے دھندلکے کو درخشاں کرنے کی کوشش کی ہے اس کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ ان پر انگریزی اور ہندی شاعری کا بھی براہ راست اثر ہے۔ ندا کے گیت سریلے صاف اور خوشنما ہیں۔ ان کے گیتوں کی افسردگی، تحیر گھٹن، آرزومندی، ترنم اور غنائیت یہ سب کچھ ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ ندا فاضلی نے گیت کو فروغ دینے میں جو نئی تراکیب، نئے تجربے اور علامتی اسلوب اپنایا ہے وہ ان ہی کا کام ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں بھی گیت کی ہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ محبت سے گہری عقیدت و بے یقینی کا عالم اجتماعیت کا دم اور غم کی تلخی ندا فاضلی کے شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔ ان کی شاعری میں یہ موضوعات شدت سے محسوس کئے جاتے ہیں۔

- بقیہ -

لرزشیں، نہ مخملیں باہیں اور نہ جھلکتے ہوئے آنچل بلکہ یہ شاہراہ بادی النظر میں بدنما ہے مگر خوبصورت ہے اور اس میں حقیقت کی جھلک ہے۔ کیونکہ جنسی خواہش اور عشقیہ شعور نسل انسانی کی بقا کے لئے اور ذہنی سکون کے لئے بہت ضروری ہے ندا فاضلی نے فکر و احساس کی ایک نئی تکنیک اس نظم میں دی ہے۔ ان کے مصرعوں میں وہ تکنیک اور موزونیت ہے کہ ان کے اسلوب میں خلاقانہ انفرادی خصوصیت محسوس ہوتی ہے۔

PHONE 543426
HOTEL
DELUXE
NEAR
CITY KOTWALI
IBRAHIMPURA
BHOPAL

اُردو اکادمی، دہلی کی طرف سے اُردو دُنیا کو
دو خوبصورت تحفے

ہر ماہ منتخب موضوعات پر اعلیٰ تحقیقی، تنقیدی اور معلوماتی مضامین اور تخلیقی ادب کی تمام اہم اصناف کی مکمل نمائندگی

مُلک اور بیرونِ مُلک کے نئے پُرانے اہلِ قلم کے تعاون کے ساتھ

سائز: ۲۰×۳۰/۸ فی شمارہ: ۲/۵۰ روپے
صفحات: ۵۶ زرِ سالانہ: ۲۵ روپے
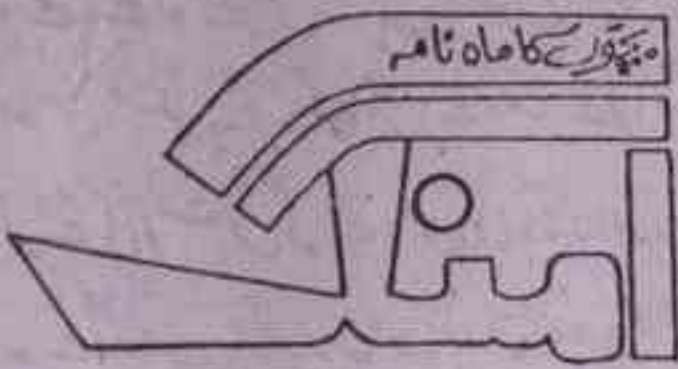
دلچسپ معلوماتی مضامین اور خبریں ○ دل کو چھو لینے والی سبق آموز کہانیاں ○ کارٹون ○ کامکس ○ لطیفے ــــ اور بھی بہت کچھ

ایک بے حد دیدہ زیب رسالہ جو بچوں میں تعلیمی لگن بھی پیدا کرے گا اور ان کی دلچسپی کا سامان بھی

سائز: ۲۰×۳۰/۸ فی شمارہ: ۲ روپے
صفحات: ۴۸ زرِ سالانہ: ۲۰ روپے

آج ہی منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا ڈیمانڈ ڈرافٹ کے ذریعے جو "سکریٹری اُردو اکادمی، دہلی" کے نام کا ہو، سالانہ قیمت بھیج کر ان رسالوں کی سالانہ خریداری قبول فرمائیں اور اپنی زبان کے فروغ میں حصّے دار بنیں

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتا:

اُردو اکادمی، دہلی ــــ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

یوسف ناظم

فاضلی ندا کو میں کمسلنہ شاعر سمجھتا تھا یہ میری غلطی تھی ندا فاضلی مرغ وغیرہ کے بارے میں شعر کہتے تھے یہ ان کی غلطی تھی اب جو دیکھتا ہوں تو ندا فاضلی ایک الگ ہی روپ میں چلے آرہے ہیں صاف شفاف بلور سے چمکتے شعر جن میں کوئی الجھاؤ کوئی جھول نہیں۔ گیتوں، اور نظموں کے اس شاعر نے اب جاکر اپنی منزل پائی ہے۔ غزل۔ معلوم نہیں کس نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا تھا اور چند دانشور قسم کے لوگ آج بھی اس کی آبروریزی پر تلے ہوئے ہیں۔ لیکن ندا نے آج غزل پایائی سے اپنا رشتہ نہیں جوڑا حالانکہ فراق ان کا وہی ہے اور صاف ستھری غزل جو زبان وخیال کی کیفیت اور کمیت سے سجی اور سرشار ہو سانکی آج کی شاعری ہے۔ ندا کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی شاعری کو زندگی کی طرح برتا ہے اور اپنے قول وفعل میں کوئی تضاد نہیں رکھا ہے غزل گو شاعروں اور گیت نما نظمیں کہنے والے شاعروں پر قوم وملک کی طرف سے کبھی یہ ذمہ داری عائد نہیں کی گئی کہ وہ اپنے قول وفعل میں کوئی تضاد نہ رکھیں۔ نہ رکھیں نبھا رکھیں ان کی مرضی۔ ندا فاضلی خود جانتے ہیں کہ نئی شاعری کا نقیب بنے رہنے میں ان کی اپنی شاعری کا کافی نقصان ہوا اور ان کی زندگی کے کئی سال نئی شاعری کے پبلسٹی افیسر بنے رہنے میں نکل گئے جب ان کی توجہ دفتری نوعیت کے اس کام سے ہٹ کر صرف شاعری پر مبذول ہوئی تو شعر ارجن کی کمان سے نکلے ہوئے تیر بن کر نکلے (یہ اور بات ہے کہ ندا اب تک کسی سوئمبر میں شریک نہیں ہوئے ہیں) غزل کے جو شعر وہ اب کہہ رہے ہیں وہ چاہتے تو آج سے پندرہ بیس برس پہلے بھی کہہ سکتے تھے۔ دیکھیے کیا خوبصورت شعر کہا ہے

اے شام کے فرشتو ذرا دیکھ کے چلو
بچوں نے ساحلوں پہ گھروندے بنائے ہیں

اس سے پہلے بھی ایک بچے کا سہارا لے کر انہوں نے بڑا عمدہ شعر کہا تھا۔

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

ان دونوں شعروں کو پھولوں کی ایک ٹوکری
میں رکھا جا سکتا ہے لیکن اسے شام بخیر شہروں کے
کے شعر میں کچھ عجیب ہی کیفیت ہے ۔ یہ شعر

مسجدوں میں سجدوں کی مشعلیں ہوئیں روشن
بے چراغ گلیوں میں کھیلتا خدا دیکھوں

ندا کی غزلوں میں آسمان پر دور تک نے والی
کہکشاں کا رنگ نہیں ہے بلکہ اس میں مٹی کی
سوندھی خوشبو ہے جو ہندوستاں کے دیہاتوں
کی ہواؤں میں رچی بسی ہوئی ہے ۔ جب ندا نے بمبئی جیسے غدار
شہر کا رخ کیا تھا تو یہ مہک اپنے ساتھ لائے تھے
اور انہیں خوش ہونا چاہیے کہ اس مہک نے ان کا
ساتھ نہیں چھوڑا ہے ۔ لڑتے تو وہ اس سے بھی ہو گئے
ان کے شعر اطلس رو کا لباس نہیں پہنے ہینڈلوم
ہی کے کپڑوں میں اپنی چھاپ دکھاتے ہیں

آنکھ کو جام لکھو زلف کو برسات لکھو
جس سے ناراض ہو اس شخص کی ہر بات لکھو

ایسا نہیں کہ اس سے پہلے آنکھ کو جام نہیں
نہیں کہا گیا ۔ سودا سے لیکر فراق تک نے یہ بات کہی
اور نہ فراق کی طرح یہ کہا ۔
دل تھا کہ ختم یہ کرتا ری نگاہ ٭ شاعر کو دیکھتا کہ میں شیشہ بنا

اسی طرح مصحفی سے لیکر آرزو لکھنوی تک زلف
کو گھٹا کہا گیا ہے ۔ اور ان میں ایک سے ایک اعلیٰ
درجے کے شعر موجود ہیں ۔ مصحفی کا ایک شعر

بکھیرے جو وہ زلفوں کو اپنے مکھڑے پر
تو مارے شرم کے آئی ہوئی گھٹا پھر جائے

اور آرزو لکھنوی نے جنہیں امام عالی کا شاعر کہنا چاہیے
کہا تھا

کسی نے بھیگے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

ندا نے نئی بات کہتے ہوئے بھی کیا بات کہی ہے
یہ نئے پن کی خوبی ہے ۔ اس میں ہاتھ
اپنا پن ہے ۔ شعر دیکھیے

یہ شہر ہے کہ نمائش لگی ہوئی ہے کوئی
جو آدمی بھی ملا بن کے اشتہار ملا

ندا فاضلی نے جب یہ کہا تھا کہ انہوں نے اپنی
شاعری میں قول و فعل کا تضاد نہیں رکھا تو شعر ان کے
ذہن سے نکل گیا تھا یہ موضوع ندا کا پسندیدہ
موضوع ہے اس سے پہلے وہ کہہ چکے ہیں اس شہر
میں سب سے ملاقات ہو گئی ۔ پھر وہ فن کاری
اور سلیقے کے شعر ہیں ۔ جن میں ندا شہر بمبئی میں رہتے

کے گر سکھاتے ہیں ۲۵ سالوں میں انہوں نے سب کچھ سیکھ لیا۔ ان کے سر کے بال شاید سفید نہ ہوئے ہیں لیکن تجربہ بہت ہو گیا ہے۔ شعر سخن گوئی تو نہیں کہتا کہ ان شعروں میں دیدہ یعقوب کی سفیدی آئی ہے لیکن حسن یوسف ضرور آیا ہے۔ ندا فاضلی کی شاعری نکھر گئی ہے یہ تو ہونا ہی تھا۔ سلیقہ چاہیے آوارگی میں بھی۔ کہنے والا شاعر ہی یہ شعر خود لکھتا ہے

اس کو رخصت تو کیا تھا مگر معلوم نہ تھا
سارا گھر لے گیا گھر چھوڑ کے جانے والا

ہماری شاعری اور زندگی میں یہی ہوتا رہا ہے جب بھی کسی شاعر کو کسی وقت کا سفر یاد آیا تھا قیامت گزر جاتی ہے ندا فاضلی نے اس خیال کو بھی بڑا ہی ہلکا اور نرم لباس پہنایا ہے۔ تراش خراش میں بھی کوئی ہیر پھیر نہیں ہے۔

دور کے چاند کو ڈھونڈو نہ کسی آنچل میں
یہ اجالا نہیں آنگن میں سمانے والا

ندا عمر کی اب اس منزل پر ہیں جہاں کسی کو پانے کی آرزو سے زیادہ کسی کو کھونے کا غم انہیں پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہے۔ —ہ—

حلقہ ادب لکھمنیاں کا
ششماہی جریدہ
علم و ادب
چیف ایڈیٹر۔ چودھری احسان الزماں
ایڈیٹر۔ طارق متین
فی شمارہ ۔/6 روپے
سالانہ ۔/۱۰ روپیے
رابطہ :- علم و ادب ڈاکخانہ لکھمنیاں
ضلع بیگوسرائے (بہار)
۸۵۱۲۱۱

ابھی نہیں ہے شہر کے پیڑوں کی دوستی

انور خان

انتظار حسین نے اپنے روزانہ کالم میں ایک بار لکھا تھا کہ "اس شہر کا شاعر وداع ہوتے درختوں کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ پچھلے برس اسی خیال پر انارکلی جانے والی سڑک کے موڑ پر کھڑا ایک بزرگ درخت کارپوریشن کی زد میں آیا تھا تو میں نے اس کا ذکر بیرسٹر افسانہ نگار سے کیا۔ بیرسٹر موصوف نے کہا تم ناسٹلجیا میں مبتلا ہو۔ اپنی بستی کے املی کے پیڑوں کا نوحہ کرتے کرتے لاہور کے درختوں کے بارے میں جذباتی ہونے لگے۔ مگر یہ کوئی قصبہ نہیں ہے یہ نیا شہر ہے اور ہم بیسویں صدی میں رہتے ہیں۔ املی کا پیڑ مجھے ندا فاضلی کی یاد دلاتا ہے۔

ندا فاضلی خود نوشت۔ دیواروں کے بیچ میں اپنے گھر کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں: "صبح کے دھندلکوں سے گوالیار کا ایک محلہ دھیمے دھیمے ابھر رہا ہے نئی سڑک، بڑے دالان اور آنگن اور کئی کشادہ کمروں کا ایک اونچی دیواروں کا پرانا گھر۔ اس گھر میں دائیں بائیں کئی دروازے ہیں سامنے املی کا درخت ہے جس میں بارہ مہینے کھٹے کٹارے جھولتے ہیں ان کو پوری دوپہر محلے کے بچے ٹکر کراتے رہتے ہیں۔ ان کٹاروں کی چھینا جھپٹی میں ہر روز کئی چھوٹی بڑی لڑائیاں ہوتیں۔ ان لڑائیوں میں کبھی بڑی عورتیں بھی شامل ہو جاتیں۔

اسی املی کے پیڑ کا ایک بڑا بھائی اور بھی ہے گھر کے بائیں دروازے سامنے لمبے چوڑے پیٹ اور کئی موٹے بھاری ہاتھوں والا نیم کا درخت ...... یہ دونوں عمر کے لحاظ سے بزرگ ہیں ان کی عمروں کا اب کوئی اس محلے میں نہیں ہے

درخت ہماری تہذیب کا یا تیسری دنیا مرکزی علامیہ ہیں۔ کوفی اونور کی نظم کیتھیڈرل ملاحظہ ہو

On this dirty patch
a tree once stood
shedding incense on
the infant corn:
its boughs stretched
across heaven
brightened by the

last lines of a tri-
be. They sent sur-
veyors and builders
who cut that tree
planting in its place
A huge senseless
cathered of -
doom.

(Kofi Awoonor)

بہرحال خواہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں۔ دنیا پہلی ہو
دوسری ہو یا تیسری پر ہمارے ہی ممالک موڈرنائزیشن
کے زیر اثر ہیں۔ کہ معاشیات جدید ٹیکنالوجی کے تقاضوں
سے بچنا اب ناممکن ہو چکا ہے۔ بڑے شہر نئے ٹیکنو
پولیٹن ثقافت کے مظہر ہیں اور کسی دیوزاد عنکبوت
کی طرح انسانوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ شہر جہاں
انسان اپنی پہچان، اپنا حسب نسب، نام پتہ
حتیٰ کہ کبھی کبھی اپنی انسانیت تک کھو بیٹھتے ہیں۔
بس ایک نمبر، مشین کا ایک پرزہ بنکر رہ جاتے ہیں
بقول ہاروے کاکس
کالج کا ایک لڑکا بھی جانتا ہے کہ آج کا جدید انسان
محض ایک بے چہرہ صفر ہے۔ ایک عدد یا آئی بی

ایم کارڈ میں چھوٹے چھوٹے سوراخوں کا ایک
سلسلہ جو ئی ایس ایلیٹ کے بنجر ویرانے
میں اپنی شناخت تلاش کر رہا ہے
اس کے سب ہی شہروں کی
بے شخصیت زندگی سے پیدا ہونے والے روحانی
خوف کا ذکر کیا ہے اب
تیسری دنیا بھی اس عذاب کا شکار ہو چلی ہے بمبئی
کلکتہ، کراچی، ڈھاکا، سنگاپور، کولمبو، ہانگ کانگ
سب اسی جدید کاری کا شکار ہیں، جو ایک ناگزیر
ضرورت بن چکا ہے۔
اکثر جدید مہانگروں میں گاؤں اور بیسوی
صدی کے انتہائی ترقی یافتہ، صنعتی معاشرے کے
لوگ پہلو بہ پہلو سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ بھابھا
ایٹمک انسٹی ٹیوٹ میں کام کرنے والے سائنس
دانوں کی کالونی کے پیچھے ممکن ہے دربھنگہ سے آگے
لوگوں کی جھونپڑیاں ہوں۔ کام، بہتر حالات، آسائشوں
سہولتوں، اور شہری زندگی کا سحر انسانوں کو
شہروں کی طرف کھینچ لاتا ہے۔ امیدیں پوری نہیں
ہوتیں۔ لیکن جادو باقی رہتا ہے۔ بقول ہربرٹ
ایک چھوٹے سے

گاؤں میں کوکا کولا کا اشتہار بھی صدیوں کی روایتی گاؤں کی شناخت اور قدروں میں دراڑ ڈال سکتا ہے۔ شعوری طور پر میڈیا اور اشتہاروں کے زیر اثر انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ بہتر زندگی تو بس شہروں میں ہے۔ معمولی سا بال پائنٹ پین یا کلائی پر بندھی گھڑی بھی اس نئی ثقافت کے پیغامبر ہو سکتے ہیں۔ اب گاؤں کے بچے بھی ماؤں سے میگی (فوری غذا) کی ضد کرتے ہیں۔

ایک حساس ذہن انسان جب چھوٹے سے قصبے سے بمبئی یا کلکتہ جیسے شہر میں پہنچتا ہے تو ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ اردو شاعری میں شہر کی ہیبت ناکی اور غیر انسانی رویے کا ذکر کوئی نئی بات نہیں۔ اختر الایمان، سردار جعفری، جاں نثار اختر، باقر مہدی، عزیز قیسی، عمیق حنفی، شہاب جعفری، اور دوسرے کئی شعراء کے یہاں اس کا ذکر مل جائیگا۔ شہری مزاج مجلسی اخلاق اور شہری قدروں اور رویوں پر البتہ بہت کم نظمیں، غزلیں، ملیں گی۔ شاید چند مثالیں اختر الایمان، باقر مہدی، یا بلراج کومل کے یہاں مل جائیں۔ ندا فاضلی کا یہ خاص موضوع ہے۔

ندا فاضلی ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرتضیٰ حسن (دعا ڈبائیوی) علی گڑھ کے پاس ایک چھوٹے سے قصبہ ڈبائی کے رہنے والے تھے۔ والدہ جمیل فاطمہ دلی کی تھیں۔ ماہ نامہ عصمت اور رہنمائے تعلیم، میں ان کی غزلیں مخفی تخلص کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ ندا فاضلی کا بچپن گوالیار میں گزرا، جہاں ان کے والد ملازم تھے۔ شاعری کا چسکہ لڑکپن میں پڑ گیا۔ لکھتے ہیں "گھر کا ماحول اور والد کے ساتھ شعری نشستوں میں شرکت نے ندا میں بھی ادبی ذوق پیدا کر دیا ہے۔ سمجھ بوجھ کیا خاک ہے۔ ہاں چھوٹی عمر میں وزن میں مصرع جوڑنے کی صلاحیت ظاہر ہوتی ہے۔ نصاب کی کتابوں سے زیادہ قافیوں کی تلاش میں وقت ضائع کرتے ہیں یادداشت اچھی ہے۔ داغ، نوح اور اپنے والد کے بہت شعر یاد ہو گئے ہیں۔ انہیں کو الٹ پھیر کر شعر بنا لیتے ہیں"

گوالیار میں آئے دن نشستیں ہوتی رہتی ہیں اچھا خاصا ادبی ماحول ہے۔ اساتذہ میں ضیا عباس حکیم احمد، کپتان تاباں، نارائن پرشاد مہر، مخفی گوالیاری، ریاض جیوری، دعا ڈبائیوی ہیں۔ جاں نثار اختر حال ہی میں تعلیم مکمل کر کے آئے ہیں اور

وکٹوریہ کالج میں لیکچرر منتخب ہو گئے ہیں۔ ان کی
شراب نوشی کی طرح ان کا عشق بھی مشہور ہے
یہ عشق بھی غیر روایتی ہے۔ ایک شادی شدہ خاتون
کو موضوعِ سخن بنائے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔

جان نثار کی نئی شاعری اور شاعرانہ زندگی نے
ان کے ارد گرد نوجوان شاعروں کا حلقہ پیدا کر دیا ہے

داغ، نوح ناروی، دعا ڈبائیوی اور جان
نثار اختر کی رومانی شاعری نے ندا کو شعر کہنا تو سکھا دیا
لیکن خود اپنا لہجہ انہوں نے پایا کبیر، سور داس
میرا اور ہندی کے نئے شعرا سے۔ اس کی
وجہ خود انہوں اس طرح بیان کی ہے۔

۔۔۔۔۔ بی۔ اے۔ کے پہلے سال میں ندا کو مجبوراً
اردو کے بدلے ہندی لینی پڑتی ہے۔ ان کا خالی
وقت لائبریری میں گزرتا ہے۔ لائبریری میں
بھی ان کتابوں کے ساتھ جن کا تعلق شاعری سے ہے
یہ شاعری کی کتابیں داغ، ان کے معاصرین اور
ان کے شاگردوں تک محدود ہیں۔ زبان کے
چٹخارے کے ساتھ سیدھی شوخ باتیں اچھی
لگتی ہیں۔۔۔۔۔ شعر سننے سنانے میں بہت لطف
دیتے ہیں۔ مگر ان کی اجتماعی سے انفرادی جذبوں
کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ اس کا احساس ندا کو
کالج کی ایک لڑکی مس منڈن کو دیکھ کر ہوتا ہے

(ماہ نامہ شاعر)

اردو غزل میں محبوب سے گفتگو کا ایک شائستہ
مہذب اور تربیت یافتہ لہجہ ہے۔ گفتگو چاہے عورت
سے ہو یا خدا سے عشقیہ جذبات، عشقیہ مراحل
۔۔۔۔۔ اپنی تمام تر نزاکتوں کے ساتھ، باریکیوں
کے ساتھ صدیوں سے شاعر بڑے خوبصورت
انداز میں بیان کرتے رہے ہیں۔ لیکن اب عوام
ان جذبوں، رویوں اور بیان کرنے کے انداز
اور لب و لہجہ سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ انہیں
نیا پن محسوس نہیں ہوتا۔ ہمارے نوجوان اور بزرگ
شاعر البتہ مسلسل کوشش کرتے رہے ہیں کہ غم
محبوب اور غم روزگار اپنی تمام تر بدلی ہوئی کیفیتوں
کے ساتھ شاعری میں آسکیں۔ اس ہی لئے انھوں نے
غزل کی زبان اس کے لب و لہجہ کو بھی بدلنے
کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ کام روز بروز مسلسل
مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ ندا فاضلی نے غزل کی ڈ
لفظیات جو روایت کا حصہ بن چکی ہیں۔ لی ہیں
اس لئے وہ اس سے آسان گزر رہے۔ نوجوانی کی

رنگیں۔ آوارہ مزاجی، بدلتے موڈ، اور بے فکری
کے ساتھ خالص ہندوستانی امیجری استعمال کی
پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو تراکیب گز نیز قصبات کی فضا
اور گھریلو نیم روحانی موضوعات نے زبان و
موضوع دونوں سطح پر ندا کو دیگر اردو شاعروں
سے بالکل مختلف کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بقول
فضیل جعفری اپنے پہلے مجموعے کی اشاعت سے
قبل ہی انہیں ایک اہم شاعر تسلیم کر لیا گیا۔ ندا
کی شاعری میں گلی کوچوں، قصبوں یا صبح و شام
کے بیان سے ذہن میں تصویر بنتی ہے وہ واضح
طور پر یہ احساس دلاتی ہے کہ یہ کسی ہندوستانی
گاؤں، شہر، یا قصبے کی ہی ہو سکتی ہے

شور کرتا ہوا
چھت پر گرا ماچھے کا سرا
ننھے پیروں سے
لپٹنے لگی خاموش گلی

شام ہونے کو ہے
پیلی دھوپ
پیچھے سے اتر کر
اون کے گولے سی بستر پر پڑی ہے

رنگ میں ڈوبی دشائیں
تینوں میں سر سراتی اپسرائیں
تم نہیں ہو

صبح کی دھوپ
ڈھلی شام کا روپ
فاختاؤں کی طرح سوچ میں ڈوبے تالاب

انیس پر اپنے ایک مضمون میں سلیم احمد نے
لکھا ہے کہ میر انیس کے انسان کو ہم اردو شاعری
میں پہلی بار اس کے خاندانی رشتوں میں دیکھتے ہیں
یہ رشتے عملی زندگی میں جو کچھ بھی ہوں۔ لیکن میر انیس
کے سوا کسی اور شاعر نے انہیں اتنے احترام، اتنی محبت
اتنے دکھ کے ساتھ نہیں دیکھا کہ وہ تخلیق کا موضوع بنتے
جدید تنقید میں سماجی انسان کا بہت شور مچا ہوا ہے،
مگر اردو میں کسی شاعر نے سماجی انسان پیش کیا ہے
تو میر انیس نے۔ یہاں انسان اپنے بنیادی ماحول
میں ہے۔ باپ، بیٹا، بھائی، بہن، چچا، بھتیجا، ماموں
بھانجے، ماں، بیٹی، ساس، بہو، نند، بھاوج

شوہر، بیوی، دوست احباب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ رشتے تجریدی اور سوچے سمجھے نہیں ہیں۔ میرانیس نے انہیں ذہن سے پیدا نہیں کیا نہ جذبات سے یہ تو میرانیس کی روح میں موجود ہیں۔

ندا فاضلی کی شاعری میں خاندانی رشتے ہندوستانی مزاج کی پوری رنگینی اور عصری انتشار کے اظہار کے ساتھ آتے ہیں۔ گھر اور رشتوں کے تصور کو آج کے کسی شاعر نے شاید ہی اس قدر شدت سے محسوس کیا ہو جس قدر ندا نے۔

رخصت ہوتے وقت
اس نے کچھ نہیں کہا
لیکن ایرپورٹ پر اٹیچی کھولتے ہوئے
میں نے دیکھا
میرے کپڑوں کے نیچے
اس نے
اپنے دونوں بچوں کی تصویر چھپا دی ہے
تعجب ہے
چھوٹی بہن ہو کر بھی
اس نے مجھے ماں کی طرح دعا دی ہے
(رخصت ہوتے وقت)

میری ماں

ہر دن اپنے بوڑھے ہاتھوں سے
ادھر ادھر سے مٹی لاکر
گھر کی کچی دیواروں کے زخموں کو بھرتی رہتی ہے
تیز ہواؤں کے جھونکوں سے
بے چاری کتنی ڈرتی ہے
میری ماں کتنی بھولی ہے
برسوں کی سیلی دیواریں
چھوٹے موٹے پیوندوں سے
آخر کب تک رک پائیں گی
جب کوئی بادل
گرجے گا
ہر ہر کرتی ڈھے جائیں گی
(کچی دیواریں)

مہندی لگے ہاتھوں میں توے کی کالونچ
آنکھوں کے ہرن قید میں گھبراتے ہیں۔
روتے ہوئے بچے پر نظر پڑتے ہی۔
چولی کے کئی ٹانکے ادھڑ جاتے ہیں

میراجی ان نظموں کو پڑھتے تو یقیناً مبہوت ہوتے
یہ نظمیں اساطیر اور تاریخ کو مس کیے بغیر ہماری

معاشرتی زندگی کے ایسے رُخ پیش کرتی ہیں
جو صدیوں سے ہماری زندگی کا خاصہ رہے ہیں۔ جن سے
ہماری سانسوں کا رشتہ ہے۔ مگر یہ تصویریں
ٹھہری ہوئی نہیں۔ آج یہ خاندانی ادارے جس قدر
تناؤ اور دباؤ کا شکار ہیں اس کا پورا احساس
ندا فاضلی کو ہے۔ اور اس کا پورا اظہار ان کی
شاعری میں ملتا ہے۔

کچے بخیوں کی طرح رشتے ادھڑ جاتے ہیں
لوگ ملتے رہیں مگر مل کے بچھڑ جاتے ہیں

نہ جانے کون سے لمحے کی بددعا ہے یہ
قریب گھر کے رہوں اور گھر نہ جاؤں میں

چراغ جلتے ہی بینائی بجھنے لگتی ہے
خود اپنے گھر میں ہی گھر کا نشاں نہیں ملتا

گھریلو رشتے۔ گھر آنگن، ہندوستانی مزاج
موسم کا عکس ندا کی شاعری کی اہم خصوصیات
ہیں مگر اس سے بھی اہم عنصر جو انہیں اپنے نوع
کے دوسرے شاعروں سے الگ کر دیتا ہے
وہ ہے ان کی شاعری میں آج کے عہد کے
انسان کی ذہنی کشمکش کا اظہار۔ شاید وہ بھی
اور بہت سے شاعروں کی طرح اپنے بنائے
ہوئے دائروں میں محصور ہو جاتے مگر بمبئی شہر
کی ہنگامہ خیز پرآشوب زندگی نے انہیں ایک بڑے
تجربے سے دوچار کیا۔ ہلکی پھلکی رومانی نظموں سے
اب وہ انسان کو درپیش ذہنی روحانی مسائل پر
آ گئے۔ اپنے عہد کی حشر سامانی کو انھوں نے محسوس کیا
اور اس کا اظہار بھی کیا۔ اس تجربے نے انہیں اپنے
معاصر شاعروں سے بھی مختلف کر دیا۔

ندا فاضلی کی شاعری آج کے ناقابل برداشت
عہد میں ایک ذہین انسان کی اپنے حواس و ادراک
کے ساتھ زیست کرنے کی کوشش ہے۔ وہ منیر نیازی
کی طرح فطرت کے اسرار کا شیدائی نہیں نہ وہ
ناصر کاظمی کی طرح ماضی کے سپنوں میں جینے کا قائل ہے
بڑے شہروں کے مسائل، بے چہرگی، تنہائی کا
احساس، کھوکھلی اخلاق اور ریاکاریاں۔ منافقتیں
سماجی تحفظات ــــــ ان سب سے گھبرا کر وہ
کوئی خیالی دنیا نہیں بساتا

تمہاری شکایت بجا ہے
مگر تم سے پہلے بھی
دنیا یہی تھی
یہی آج بھی ہے

یہی کل بھی ہوگی
تمہیں بھی اسی اینٹ پتھر کی دنیا میں
پل پل بکھرنا ہے
جینا ہے
مرنا ہے

یہ مسلسل مکالمہ، جینے کی یہ کوشش آج کی شہری مجلسی زندگی کے تلخ حقائق سے ہمارا سامنا کرواتی ہے۔ ہم اس شاعری سے خود کو بہت قریب پاتے ہیں۔ یہی اس کی مقبولیت کا راز ہے اور اس کی انفرادیت کی پہچان بھی

چمکتے کپڑے، مہکتا خلوص، پختہ مکاں۔
ہر ایک بزم میں عزت حفاظتیں مانگے

شائستہ محفلوں کی فضاؤں میں زہر تھا
زندہ بچے ہیں ذہن کی آوارگی سے ہم۔

کسی سے خوش ہے، کسی سے خفا خفا سا ہے
وہ شہر میں ابھی شاید نیا نیا سا ہے

اور دل جیسے ہو کر ہم بھی باعزت ہیں بستی میں
کچھ لوگوں کا سیدھا پن ہے کچھ اپنی عیاری ہے

دنیا نہ جیت پاؤ تو ہارو نہ آپ کو
تھوڑی بہت تو ذہن میں ناراضگی رہے

بڑے شہروں کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے اُسے سمجھنا آسان نہیں۔ پرانی اخلاقیات سے بھاگروں کی زندگی کو ناپنا غلط ہوگا۔ ہارڈ کوکس Harvey Cox نے اپنی کتاب سیکولر سٹی میں Secular City ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ پروٹسٹینٹ پادریوں نے فلک بوس عمارتوں والے ایک علاقے میں سروے کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ایسے علاقوں میں چونکہ لوگوں کے اپنے پڑوسیوں سے تعلقات کم یا برائے نام ہوتے ہیں۔ کوشش کی جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب ہو سکیں انھیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ لوگ خود ہی ایک دوسرے سے قریبی تعلقات قائم کرنے کے خواہشمند نہیں تھے۔ پہلے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ ایک مریضانہ صورت حال ہے لیکن غور کرنے پر انہیں سمجھ میں آیا کہ شہروں میں بچاؤ کی خاطر یہ ہنر بھی لازمی ہے شہر کے لوگ تعلقات بنانے میں خاصے محتاط ہوتے ہیں اور ضروریات اور مسائل کے تحت ہی دوستیاں بناتے ہیں

اس کھلے پن دس میں رہنا ضروری نہیں اس طرح
اپنے وقت اور توانائی کو اپنے حسب منشا صرف کرتے ہیں
شہر میں سینکڑوں آدمیوں سے ملنا ہوتا ہے بینک
کلرک، کیشیر، دودھ لانے والا، مہتر، شہری آدمی
کیشیر کو کیشیر کی حیثیت سے ہی جانتا ہے جبکہ گاؤں
کا یا قصبے کا آدمی لوگوں کو ہمیشہ ان کے نام سے
پہچانتا ہے۔ شہر کا آدمی ہر شخص سے قریبی تعلقات قائم نہیں
کر سکتا۔ قریبی تعلقات محض چند مخصوص لوگوں سے
ہی ہوتے ہیں۔ جن سے وہ ہم آہنگی محسوس کرتا ہے ایک
چھوٹے شہر یا قصبے میں لوگ ایک دوسرے کے بارے
میں جانتے ہیں۔ اور مزید جاننے کے خواہشمند ہوتے ہیں
بڑے شہر کا آدمی پرائیویٹ اور پبلک امور میں فرق
قائم رکھتا ہے وہ دوسروں کے مسائل میں ٹانگ نہیں
اڑاتا نہ دوسروں کی مداخلت پسند کرتا ہے۔ یہ آزادی
اسے اپنے طور پر جینے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ بقول
جین جیکبس (Jane Jacobs) شہر ایسے لوگوں سے
بھرے پڑے ہیں۔ جن سے ایک حد تک رابطہ مفید
یا دلچسپ ہے اور آپ کو اچھا لگتا ہے لیکن آپ نہیں
اپنے بالوں میں پسند نہیں کرتے نہ وہ آپ کو اپنے
بالوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ ہر شخص سے
ملنے جلنے لگیں تو زندگی آپ کے لئے وبال ہو جائے
شہری زندگی کا یہ رخ جو باہر سے آئے آدمی کو
عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ لوگ اسے دوسری
زندگی بسر کرتے نظر آتے ہیں۔ اچھے برے دونوں
پہلوؤں سے ندا کی شاعری میں نظر آتا ہے

ملنے جلنے کا سلیقہ ہے ضروری ورنہ
آدمی چند ملاقاتوں میں مر جاتا ہے

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا کئی بار دیکھنا

وہ آدمی تھا کتنا بھلا کتنا پرخلوص
اس سے بھی آج لیجئے ملاقات ہو گئی
تمام شہر میں ایسا نہیں خلوص نہ ہو
جہاں امید ہو اس کی وہاں نہیں ملتا

ضروری کیا ہے ہر اک محفل میں بیٹھیں
تکلف کی روا داری سے بچئے
اچھی نہیں ہے شہر کے رستوں کی دوستی
آنگن میں پھیل جائے نہ بازار دیکھنا

مل جل کے بیٹھنے کی روایت نہیں رہی
راوی کے پاس کوئی حکایت نہیں رہی

ندا فاضلی کی شاعری میں ایک لفظ بار بار آتا ہے
—سفر— اصرار اس بات پر ہے کہ:

اپنی تلاش، اپنی نظر، اپنا تجربہ
رستہ ہو چاہے صاف بھٹک جانا چاہیے

ظاہر ہے یہ سفر ذہنی ہے، تصوراتی ہے

کہاں ہر ایک کو آتی ہے راس آزادی
نئے سفر کی مسافت وہ ہاتھیں مانگے

جن میں کھو جانے کا خدشہ تھا بہت
ہم نہ کھو پائے وہ بیٹے کھو گئے

ہر اک سفر کو محفوظ راستوں کی تلاش
حفاظتوں کی روایت بدل سکو تو چلو

کیا اس سفر کی کوئی منزل بھی ہے
نکل آئے کدھر منزل کی دھن میں
یہاں تو راستہ ہی راستہ ہے

دو چار گام لگو ہموار دیکھنا
پھر ہر قدم پہ اک نئی دیوار دیکھنا

یہ سوچ، یہ سفر ندا فاضلی کو کہاں لایا ہے

یہ زندگی جو آج تمہارے
بدن کی چھوٹی بڑی نسوں میں مچل رہی ہے
تمہارے پیروں سے چل رہی ہے
تمہاری آواز میں
گلے سے نکل رہی ہے
تمہارے لفظوں میں ڈھل رہی ہے
یہ زندگی جانے کتنی صدیوں سے
یونہی چہرے بدل رہی ہے۔
بدلتے چہروں
بدلتے جسموں میں
چلتا پھرتا یہ شرارہ
جو اس گھڑی نام ہے تمہارا
اسی سے ساری چہل پہل ہے
اسی سے روشن ہے ہر نظارا
ستارے توڑو
کہ گھر بساؤ
قلم اٹھاؤ
کہ سر جھکاؤ
تمہاری آنکھوں کی روشنی تک ہے کھیل سارا
یہ کھیل ہوگا نہیں دوبارا

اس انکشاف میں کوئی بہت ندرت نہیں
ندرت بس اس بات میں ہے کہ ندا کا اصرار ہے
کہ چھوٹی بڑی ہر سچائی تک خود اپنے تجربے سے
پہنچنا چاہیے۔ کتابی سچائی تو بس کتابی ہوتی ہے
انسان کے ظاہر و باطن میں اس سے کوئی تبدیلی
واقع نہیں ہوتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ اتنی بڑی
بڑی مذہبی، علمی اور فلسفیانہ کتابیں پڑھ کر بھی کورے
کیوں رہتے۔

مشکل یہ ہے کہ آج ہماری سوچ ہمیں دور
تک نہیں لے جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم دائرے میں
میں سفر کر رہے ہوں۔ باطن کا سفر اکثر نرگسیت
کی تاریک بھول بھلیوں میں پھنسا دیتا ہے اور ہمیں
علم بھی نہیں ہوتا۔ آج تحلیل نفسی ایک فیشن بن چکا ہے
بقول شخصے ہر امیر آدمی، آج ایک سائیکو انالسٹ ہے
گذشتہ تیس برسوں سے اعترافی نظمیں Poems
Confessional زیادہ لکھی جا رہی ہیں۔
کرسٹو فر لیش کے خیال میں اعترافی فارم ایک
ایماندار ادیب کے لئے ہمارے عہد کے روحانی
افلاس کا دہشت ناک بیان ہوتا ہے۔ لیکن ایک سہل
پسند ادیب کے لئے اکثر اوقات بے حیائی کا مظاہرہ
بن جاتا ہے۔ خصوصاً فکشن میں جو انشا کے بجائے
بہت کچھ چھپا جاتا ہے۔

نرگسیت آج کے دور کا خاص روگ ہے تحلیل
نفسی کے ماہرین کا کہنا ہے کہ آج جو مریض ان
کے پاس آ رہے ہیں، انہیں ہسٹیریا، بار بار ہاتھ
دھونا ایسی شکایتیں نہیں یہ لوگ نرگسیت کا شکار ہیں
اپنی زندگی میں خالی پن محسوس کرتے ہیں۔ اُن میں
خود اعتمادی کا فقدان ہے۔ لوگوں سے قریبی تعلقات
نہیں قائم کر پاتے۔ نرگسیت کے شکار روگ اس لئے
تحلیل نفسی کے ماہرین کی نظروں میں آ جاتے ہیں کہ
یہ لوگ گورنمنٹ اداروں بزنس کارپوریشنوں اور
بعض تحریکات میں نمایاں مقام حاصل کر لیتے ہیں
ناولسٹ اور ڈراما نگار آج خود اپنی تخلیقات کے
مصنوعی ہونے کا اعلان کرتے ہیں بہت سے ادیب
اپنی یادداشت کے تجزیے کے بجائے اعترافات
کو زیادہ آسان سمجھتے ہیں۔ اس سے قاری کے
تجسس کو کہ وہ مشہور لوگوں کے ذاتی معاملات
اور نجی زندگی کے متعلق جان تسکین ملتی ہے۔ نارمن
میلر اور اُن کے مقلدین کی تحریروں میں جو مصنف
کی اپنی خواہشات — اور اُمنگوں کے تنقیدی

تجزیے سے شروع ہوتی ہیں اس بات کا اعتراف
ہوتا ہے۔ کہ وہ بطور ادبی شخصیت کے لافانی ہونے
کا خواہشمند ہے۔ یہ تحریریں خود کلامی پر ختم ہوتی ہیں
جو ان کے اپنے مشہور شخص (celebrity)
ہونے کے بارے میں ہوتی ہے۔ ایک بار پبلک کی
توجہ مل جائے۔ تو ادیب کو بے اعترافات کی
تیار مارکیٹ مل جاتی ہے ایریکا جونگ نے جنس پر
مردوں کی طرح غیر جذباتی انداز میں لکھ کر مقبولیت
حاصل کی۔ اور اگلا ہی ناول ایک ایسی نوجوان
عورت پر لکھ ڈالا۔ جو ایک ناول لکھ کر مشہور ہو گئی ہے

ندا کی شاعری میں اس قسم کی گیست نہیں
ملتی لیکن ان کا شعری مواد اور لہجہ بار بار اس خطرے
سے دوچار کرتا ہے۔ خود تنقیدی اور سہل پسندی
کے بیچ ایک مہین خط ہے۔ جس کا ہمیشہ خیال رکھنا
مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ کبیر، سور داس، غالب
اور ایسے دوسرے کئی شاعر ذہن کو ایک نوع کی آزاد
خیالی سے روشناس کرواتے ہیں اور محدود فکر کے
دائروں سے رہائی حاصل کرنے میں مدد کرتے ہیں
لیکن آج کے اشیا پرستی کے دور میں زندگی کو
زیادہ معنی خیز بنانا آسان نہیں۔ صوفی اور بھگتی شعرا
بھی ایک حد تک اس معاملے مددگار ثابت نہیں ہوتے
آج کا انسان ہر بات کا تجزیہ کرنا چاہتا ہے اسے
عقلی سطح پر پرکھنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ
کسی بات کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتا ہے جبکہ زندگی
بڑی پراسرار شے ہے۔ ہر تجزیہ ادھورا اور
نامکمل ثابت ہوتا ہے۔ اور انسان یہ محسوس کرتا ہے
کہ سمندر سے چلو بھر ہی لے پایا ہے۔ دوسری طرح اشیا
سے زیادہ سے زیادہ لگاؤ اس کی زندگی کو کوئی
معنی نہیں دے پاتا۔ بلکہ انسانوں کو بھی وہ اشیاء
کی طرح استعمال کرنے لگتا ہے اور انسانوں سے
بامعنی اور جاندار تعلقات کے بغیر زندگی اپنے مفاہیم
کھو دیتی ہے۔ آج کا انسان دوسرے انسان سے معنی خیز
اور بے حد قریبی تعلق قائم نہیں کرتا وہ ایک فاصلہ باقی
رکھتا ہے اور جب اس فاصلے کو کم ہوتے دیکھتا ہے تو
گھبرا جاتا ہے چاہے وہ تعلق دوستی کا ہو یا کسی عورت سے
عشق یا لگاؤ کا ہو۔ دیوانگی میں بھی وہ اپنے ہوش و
حواس باقی رکھنا چاہتا ہے وہ وابستگی (commit-
ment) سے گھبراتا ہے کسی عورت سے بھی وہ عشق
کرتا ہے تو تعلق کی سطح اس قسم کی رکھتا ہے۔ کہ کسی
بھی وقت الگ ہو سکے۔ وابستگی اور قربت (intimacy)

کے بغیر زندگی زیادہ دلچسپ
اور معنی خیز نہیں ہوتی اور ایک خلا اور تشنگی سی محسوس
ہوتی ہے جسے انسان مسلسل اشتہاری غذاؤں،
فلموں، دواؤں اور موسیقی، جنس اور ٹی وی
پروگراموں کے مسلسل ہیجان سے پر کرنے کی
کوشش کرتا ہے لیکن نہ خلا بھرتا ہے اور نہ تشنگی
دور ہوتی ہے۔ بار بار وہ بورڈم کا شکار ہو جاتا ہے

چار چھے دن میں
میری آنکھوں نے
پی لیا اس کے پورے چہرے کو
وہ بھی ممکن ہے میرے چہرے کو
اپنی آنکھوں سے پی چکا ہوگا
وہ بھی بے چہرہ
میں بھی بے چہرہ
صرف آنکھوں کے خول باقی ہیں
جن کے اندر دھنسی ہوئی آنکھیں
بس یونہی چند بار دیکھیں گی
اور پھر رفتہ رفتہ
کچھ دن میں
یہ بھی ایک دوسرے کو پی لیں گی
(گھستے ہوئے رشتے)

یہ ایک دوسرے کو پی لینے کا المیہ آج کی کنزیومر
سوسائٹی کا المیہ ہے جہاں دوستی محبت، وفاداری
ہر چیز ایک بے جان شئے کی طرح استعمال ہوتی ہے
اور اغراض کا شکار ہو جاتی ہے

محبت میں وفاداری سے بچیے
جہاں تک ہو اداکاری سے بچیے
ہر اک صورت بھلی لگتی ہے کچھ دن
جہاں تک ہو اداکاری سے بچیے

صوفی یا یوگی انسانوں سے کنارہ کش ہو کر
خدا تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ آج کا انسان
محض مجرد سوچ کے ذریعے منزل پالینا چاہتا ہے اس لئے
زندگی اس کے لئے بس سرابوں کا سفر ہے۔

زندگی جاگی ہوئی آنکھوں کا رنگیں فریب
جو بھی گزرا وہ سرابوں کے سفر سے گزرا

ندا فاضلی کا یہ سفر انہیں اس نتیجے تک لے آیا
فطری ہے! اطمینان اب انہیں مسٹی سی زم
([illegible]) کی طرف لے آتی ہے فطرت
سے قریب ہونے، کائنات سے جڑ جانے کی
خواہش ـــ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے منبع کی
طرف لوٹ آئے ہیں۔ ان کا دائرہ مکمل ہوا یا،

اب وہ بھگتی شعراء کو پہلے سے بہتر سمجھ پا رہے ہیں
اور آج کی پیچیدہ زندگی میں اس کی معنویت کو
پہلے سے زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ آج کا انسان
جو موناڈس (monads) کی مانند الگ تھلگ
محسوس کرتا ہے۔ اس تضاد کو کیسے دور کر پائے گا؟
ندا فاضلی کے یہاں مسلسل سفر کا احساس ہوتا ہے
کہ وہ ٹھہرے گئے ہیں تو وہ پھر نئی منزلوں
کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ نظم، غزل، گیت،
اور دوہوں پر انھیں یکساں قدرت ہے۔ گیتوں
کو انہوں نے ایک نیا موڑ دیا ہے۔ ہلکے پھلکے رومانی
گیتوں سے آگے بڑھکر انھیں عصر حاضر کی حیثیت
سے روشناس کروایا ہے۔ ادھر انہوں نے بہت
اچھے دوہے کہے ہیں۔ اُن کی شاعری میں میرؔ و
غالبؔ، سوداؔ اور آتشؔ کے ساتھ میراؔ، کبیرؔ اور
تلسی داس کی شعری روایتیں ملکر ایک خوبصورت
روپ اختیار کرتی ہیں۔ جو ان کی شاعری کا
شناس نامہ ہے۔ اپنے عصر کے تلخ اور سنگین
حقائق کا اظہار انھیں جدید شاعروں میں ایک
ممتاز و منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ ان کی شاعری
ایک قاری کے دل و دماغ کو مہمیز کرتی ہے
اور اس کے جمالیاتی ذوق کی آبیاری کرتی ہے

———+ + +———

از ضیاء الانجم پرتاب گڑھی

دوہے اور ندا فاضلی

- ندا فاضلی کی نظر -

ندا فاضلی کو لفظوں کی ہے اچھی پہچان
ہلکے پھلکے جملوں میں بھی رکھ دیتا ہے جان
کرب کی شدت کا ہوتا ہے لفظوں سے اظہار
کتنے دکھ جھیلے ہیں خود پر سہے ہیں کتنے وار
سب سے الگ تھلگ ہے اس کی غزلوں کا انداز
اسی لیے وہ ہم عصروں میں ہے شاید ممتاز
جملے اس کے کھیل کھلونے حرف و لفظ غلام
کرے مہاجن کے آگے جوں حاجت مند سلام
نظم و نثر میں ہے لہجہ فکر انگیز
پڑھکر اس کو دل کی دھڑکن ہو جاتی ہے تیز
ضیاؔ ہے شاعر اپنی ڈھب کا نداؔ فاضلی ایک
چہرہ اس کا ایک ہے لیکن رنگ و روپ انیک

ترجمہ انگریزی سے

پرکاش چندر

آنکھ اور خواب کے درمیان

یہ ندا فاضلی کا ایک شعری مجموعہ ہے مکتبہ جامع نگر
دہلی نے شائع کیا ہے ندا فاضلی جو ایک جوان اور
مستقبل کے نئی نسل کے شاعروں سے تعلق رکھتا ہے
نئی نسل کا فقرہ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ جیسے
اس کے ہم عصر شاعروں کی طرح وہ اور فارسی
ترکیبوں سے بالکل علیحدہ ہے اور نہ ہی اس لئے
استعمال کیا گیا ہے کہ ندا گل و بلبل کی دنیا سے
علیحدہ۔ اس کے خیالات تازہ اور موجودہ زمانے
سے تعلق رکھتے ہیں اس کی زبان سادہ اور
صاف ہے وہ معیار پر کھرا اترتا ہے جو نئی شاعری
کا تقاضہ ہے۔ ندا غزلیں اور نظمیں دونوں کا شاعر ہے
اس کی زیادہ تاثر کرنے والی نثری نظم والد کی
وفات پر ہے۔
جس کی وجہ سے وہ اپنے باپ کے جنازے میں
شریک نہ ہو سکا تھا۔ پاکستان میں یہ تاثر خود

اس کی زبان سے یہ نظم سننے پر پیدا ہوا اس کے
اندر ایسا تاثر شامل ہے کہ ہلا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر

تمہاری قبر میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اڑائی تھی
وہ جھوٹا ہے
میری آنکھیں تمہارے منظروں میں قید ہیں اب تک
میں جو بھی دیکھتا ہوں سوچتا ہوں
وہ وہی ہے جو تمہاری نیک نامی اور
بدنامی کی دنیا تھی
کچھ بھی نہیں بدلا
تمہارے ہاتھ میری انگلیوں میں سانس
لیتے ہیں۔
میں لکھنے کے لئے جب بھی قلم اٹھاتا ہوں
تمہیں بیٹھا ہوا میں اپنی ہی کرسی پر پاتا ہوں

احسن کے بعد صرف وہ ایک شاعر ہے
جس نے ایک طوائف کی توصیف کی ہے اور اس پر
نظم لکھی ہے۔ مثال کے طور پر۔

اس کا دروازہ رات گئے تک
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی

ہر ذات کے آدمی کے لئے کھلا رہتا ہے
خدا جانے اس کمرے کی کی
کشادگی
مسجد اور مندر کے آنگن میں کب پیدا ہوگی

اس کی سوجھ بوجھ بہ عصری حسن غزلوں کے
ذریعہ بہتر طور پر ظاہر ہوتی ہے

مسجدوں میں سجدوں کی مشعلیں ہوگئیں روشن
بے چراغ گلیوں میں کھیلتا خدا دیکھوں

جناب سیفی سرونجی صاحب مکرم تسلیم

آپ کے ۲۰؍ دسمبر ۹۱ء کا خط ملا تھا سوچا
تھا کہ جواب میں آپ کو ندا فاضلی پر کوئی لکھکر بھیجدوں
مگر کوشش کے باوجود اب تک مکمل نہ کرسکا بہرحال
جلد روانہ کرونگا۔ میں ان کی خود نوشت دیواروں
کے بیچ آپ بیتی پر کچھ لکھ رہا ہوں۔ یہ نمبر کب تک
پریس میں جائے گا۔ امید ہے کہ دس فروری
سے قبل مضمون آپ کو بھیج سکونگا

امید ہے آپ مع الخیر ہونگے والسلام

ناس انصاری کانپور

TYCO MOTORS
East Boring
Canal Road
PATNA-800001

اپنی گاڑیوں کے لئے ہمیں خدمت کا موقع دیجئے
ہمارے یہاں جیپ، ایمبیسڈر، فیٹ
ماروتی اور دوسری گاڑیوں کے قابل بھروسہ
پارٹس مناسب قیمت پر ملتے ہیں۔

سیفی سرونجی کی اور ایک نثری کتاب
مدھیہ پردیش میں جدید غزل
عنقریب منظر عام پر

سیفی سرونجی

ندا فاضلی کی نظمیں

اردو کا ہر شاعر اپنے شعری سفر کی ابتدا عام طور پر غزل ہی سے کرتا ہے۔ اور صنفِ غزل کا اثر اس کے دل و دماغ پر دائمی طور پر جم جاتا ہے اردو شعر و ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ بیشتر شعرا نے اپنے اظہار کے لئے تمام عمر غزل ہی کو اپنائے رکھا۔ لیکن مولنا حالی نے نظم کو اردو میں سنجیدگی سے رواج دیا۔ اور بہت سی نظمیں وجود میں آئیں اور حالی کی پیروی کرنے کیلئے ایک بھیڑ تحریک کی شکل میں چل پڑی۔ یوں تو اردو شاعری کی ہر صنفِ سخن کو نظم ہی کہا جاتا ہے لیکن دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو میں بھی نظم نے اپنی علیحدہ سے پہچان قائم کی۔ اور غزل کے علاوہ اردو ادب کو مالا مال کرنے میں نظم کا بھی ایک اہم رول رہا ہے۔ حالی کے بعد نظم سنجیدگی کے ساتھ لکھی جانے لگی۔

اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ اردو نظم میں محمد حسین آزاد، نظیر اکبر آبادی، اکبر الٰہ آبادی، اقبال، جوش، فیض، حفیظ جالندھری، چکبست، مخدوم محی الدین، سردار جعفری، مجاز، میرا جی، ن۔م۔ راشد، ساحر، اختر الایمان نے اردو نظم کے دامن کو وسیع کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ سن ۱۹۶۰ء کے بعد جدید شعرا نے نظم کو اپنے اظہار کے لئے منتخب کیا۔ حالانکہ غزل کی تنگ دامانی کا شکوہ غالب کی طرح اُن شعرا نے بھی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی غزل مقابلے میں نظمیں کم لکھی جا رہی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ نظم لکھنا دشوار کام ہے۔ اس میں وہی شعرا زیادہ دکھائی دیتے ہیں جن کا مطالعہ وسیع ہے حالانکہ جدید نظم نے کوئی انوکھا کارنامہ انجام نہیں دیا بقول سردار جعفری کے۔ یہ ترقی پسندوں کی ہی توسیع ہے لیکن جدید نظموں کا مطالعہ اس بات کا غماز ہے کہ جدید نظم نے ترقی پسند تحریک سے ہٹ کر اپنی راہ تلاش کی ہے۔ اور ان میں جو کامیاب شاعر ابھر کر سامنے آئے ہیں ان میں خلیل الرحمٰن اعظمی، فارغ بخاری، ابن انشا، قاضی سلیم باقر مہدی، بلراج کومل، محمد علوی، کمار پاشی

وحید اختر اور ندا فاضلی کے نام اہم ہیں۔

ان شعراء کے علاوہ کچھ ایسے شعرا بھی ہیں جو ان کی پیروی سے پہلے کے ہیں لیکن انہوں نے اپنے عہد کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی نظموں میں ایک انقلابی تبدیلی لاکر جدید شعراء کی صف میں کامیاب شاعر کی حیثیت سے موجود ہیں۔ ان میں اخترالایمان شمس الرحمن فاروقی۔ محمد حسن وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں لیکن میرا مقصد نظم کی تاریخ لکھنا نہیں بلکہ ندا فاضلی کی نظموں کا سرسری جائزہ لینا ہے ظاہر ہے کہ ندا فاضلی کا شمار ایک پڑھے لکھے شاعروں میں ہوتا ہے جن میں تنقیدی شعور بدرجہ اتم موجود ہے اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ کسی بھی زبان کی کسی ایک صنف میں ہی طبع آزمائی کرتے رہنا یا اس میں گھوم پھر کر دہرائی ہوئی باتوں کو دہرانا نہ تو شاعر کے حق میں اچھا ہے۔ اور نہ زبان و ادب میں اضافہ ہو سکے گا۔ اس لئے کہ کسی ایک صنف کے پیچھے اردو کا ہر شاعر پڑ جائے تو وہ کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ جیسا کہ غزل کے ساتھ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو ادب کے لئے غزل کے علاوہ نظم، نثری نظم، ہائیکو افسانہ، ناول، ڈرامہ وغیرہ کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے۔ جتنی غزل کی۔ ندا فاضلی کے ذہن میں یہ بات بچپن سے ہی تھی یہی وجہ ہے کہ ندا فاضلی نے اپنی شاعری کی ابتدا ہی نظم سے کی۔ یہ الگ بات ہے ندا فاضلی نظم سے ہو کر غزل، گیت اور دوہے تک پہنچے۔ لیکن نظم ان کا مخصوص میدان رہا ہے اور لفظوں کا پل شاہد ہے۔ ان کی ابتدائی نظمیں منفی محرومیوں کے اظہار پر مبنی ہیں۔ حالانکہ دیہاتی زندگی شہری زندگی اور فسادات کے موضوعات پر بھی بہت سی نظمیں ہیں جو ان کے پہلے مجموعے لفظوں کا پل میں شامل ہیں۔ ندا فاضلی نے کسی مخصوص موضوع زندگی تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا۔ مختلف موضوعات پر ان کی نظمیں ہیں۔ کچھ نظموں کے اقتباس یہاں پیش کر رہا ہوں۔

دو لڑکیاں

آمنے سامنے دو نئی لڑکیاں\
جلتی سگریٹ کی لہراتی آوازیں\
سوئی ڈورے کے رنگیں الفاظ

مشورہ کر رہی ہیں کئی روزے
شاید اب
بوڑھے دروازے سر جوڑ کر
وقت کی بات کو وقت پر مان لیں
بیچ کی ٹوٹی پھوٹی گلی چھوڑ کر
کھڑکیوں کے اشاروں کو پہچان لیں

وحدانیت پر

گھانس پر کھیلتا ہے اک بچہ
پاس بیٹھی ماں مسکراتی ہے
مجھکو حیرت ہے جانے کیوں دنیا
کعبہ و سومنات جاتی ہے

اس نظم میں ندا فاضلی نے صاف طور پر بیان کیا ہے کہ جانے کیوں دنیا کعبہ جاتی ہے لوگ خدا کو کیوں صرف مخصوص جگہوں پر تلاش کرتے ہیں۔ کیا ان کے آنکھیں نہیں ہیں۔ خدا ہنستے ہوئے چہروں، ماں کے پیار، قدرت کے مناظر، جھرنوں تالابوں، پھولوں میں کہاں نہیں۔ ندا فاضلی نے اپنی بیشتر نظموں میں اس بات کا اظہار کیا ہے حد تو یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بھی اشعار اس موضوع پر مل جائیں گے۔ مثلاً

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

ندا فاضلی لفظوں کا پل، مور ناچ، آنکھ اور خواب کے درمیان تک کا سفر مختلف اصناف سخن کے ذریعہ کرتے رہے ہیں۔ لیکن لفظوں کا پل سے آنکھ اور خواب کے درمیاں کا یہ طویل سفر میں بھی ان کی محبوب صنف نظم ہی رہی ہے یہ بات الگ ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ مطالعہ، تجربہ اور مشاہدہ نئی نظموں میں بھی شامل ہوتا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ندا فاضلی اختر الایمان کے بعد اپنے ہم عصروں میں کامیاب اور بڑے شاعر دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ اور کامیاب اور مقبول نظموں کے اقتباسات پیش ہیں۔

چوتھا آدمی

بیٹھے بیٹھے یونہی قلم لے کر
میں نے کاغذ کے ایک کونے پر
اپنی ماں
اپنے باپ کے دو نام
ایک گھر اپنا کے کاٹ دیے

اور

اس گول دائرے کے قریب
اپنا چھوٹا سا نام ٹانک دیا
میرے اٹھتے ہی میرے بچے نے
پورے کاغذ کو لے کے پھاڑ دیا

ندا فاضلی کی یہ وہ مشہور نظم ہے جو نصاب میں بھی شامل رہی ہے۔ ندا فاضلی نے چھوٹے چھوٹے موضوع کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بے شمار نظمیں کہی ہیں۔ جنسیات، شہر، گاؤں، تنہائی، گھر، جنگ فسادات، خدا، انجمن، فطرت کے مناظر غرض معمولی سے معمولی موضوع ندا فاضلی کے یہاں مل جائے گا۔ اور عام طور پر جن موضوعات کو دیگر شعراء نے چھوا تک نہیں۔ وہ موضوعات ندا فاضلی کے یہاں زندہ جاوید نظر آتے ہیں

ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں "ندا فاضلی نے ذات کے اظہار، تبدیلی کی خواہش، صنعتی دور کے تشنج اور شہریت کے نئے پیکر تلاش کرنے کی کوشش کی اور اردو نظم کو ایک جدید فضا سے آشنا کرایا ندا نے اختر الایمان سے لیکر باقر تک سب سے اثرات قبول کئے ہیں لیکن ان اثرات پر قناعت نہیں کی۔ ان کو اپنی انفرادیت میں ڈھال کر نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے صنعتی دور کے شہروں کے اعصاب شکن زندگی کی ایسی بھرپور تصویریں ندا کے علاوہ شاید ان کے کسی معاصر کے کلام میں ملیں

ایک مشہور نظم دیکھیے

ایک نئی ہوئی بستی کی کہانی
بجی گھنٹیاں
او نچے مینار گونجے
سنہری صداؤں نے اجلی ہواؤں
کی پیشانیوں پر
رحمت کے۔ برکت کے پیغام لکھے
وضو کرتی صبحیں بھجن گاتے آنچل نے
پوجا کی تھالی سے بانٹے سویرے کھلے دوار
بچوں نے بستہ اٹھایا۔ بزرگوں نے پیڑوں کو پانی پلایا
نئے حادثوں کی خبر لیکے بستی کی گلیوں
میں اخبار آیا۔
خدا کی حفاظت کی خاطر۔ پولس نے
پجاری کے مندر میں۔ ملا کی مسجد میں

پھر انگا یا

خدا ان مکانوں میں لیکن کہاں تھا
انہیں تنگ و تاریک گلیوں کے اندر
وہی جل رہا تھا جہاں تک دھواں تھا

ندا فاضلی کی یہ وہ مشہور نظم ہے شاید انکی پسندیدہ بھی۔ اس لئے کہ ہر مشاعرہ میں وہ اس نظم کو ضرور سناتے ہیں۔ اس نظم پر لکھنے کے لئے کئی صفحات درکار ہیں۔ میں تو صرف نظموں کے اقتباسات پیش کرنے پر اکتفار کرتا ہوں۔ اس لئے کہ ندا فاضلی کی یہ نظم ایک ایسی شاہکار نظم ہے کہ جب تک انسان زندہ ہے۔ یہ نظم بھی پرانی نہیں ہوگی۔ ندا فاضلی کی نظموں میں جذبۂ خلوص، فکر گہرائی کیا کچھ نہیں ہے۔ اور انفرادیت تو جیسے اُن ہی کے حصے میں آئی ہے۔ اکثر شعراء کے کلام کا مطالعہ کیجیے تو نظر آئے گا۔ کہ کوئی داغ کے رنگ کو اپنی انفرادیت سمجھتا ہے کوئی کوئی کسی سے متاثر ہے تو کوئی کسی سے۔ لیکن ندا نے تو اردو شاعری کو نیا لہجہ اور نئے نئے موضوعات سے روشناس کرایا ہے۔ بلاشبہ ندا فاضلی جدید اردو شاعری کا ایک معتبر نام ہے۔ ○

اُردو ادب و صحافت کی دنیا
کا
ایک اہم نام
ماہنامہ انشاء کلکتہ
ایڈیٹر: ف۔ س۔ اعجاز
پتہ:- ۶-۱۷ اکنائی سیل اسٹریٹ
کلکتہ ۷۳

اُجلی مسکراہٹ
علیم صبا نویدی کے
افسانوں کا تازہ
مجموعہ
مرتب: ڈاکٹر عابد حنفی

ندا فاضلی۔ دوہے کی شناخت

سلیم انصاری
۵۵۹ موتی نالہ جبل پور

ندا فاضلی ایک ہمہ جہت فنکار ہے۔ شاعری کے علاوہ ان کے نثری فن پارے بھی ان دنوں ناقدین شعر و ادب کی دلچسپی کا سامان ہیں۔ ماہنامہ شاعر میں۔ دیواروں کے بیچ کے عنوان سے ان کی خود نوشت تو قارئین و ناقدین کو اپنے سے آزاد ہی نہیں ہونے دیتی۔

پچھلے کچھ برسوں سے ندا فاضلی دوہوں پر کام کر رہے ہیں۔ حالانکہ پاکستان میں دوہوں کو جمیل الدین عالی، صہبا اختر اور ہندوستان میں بھگوان داس اعجاز، س۔ ف اعجاز، اور ساغر جیدی نے اس صنف پر خصوصی توجہ دی ہے۔ لیکن ندا فاضلی نے دوہے کی تخلیقی شناخت کو زندہ جاوید کر دیا ہے

دوہا دیگر اصناف شعری مثلاً آزاد نظم، نثری نظم، سانیٹ، ترائیلے اور ہائیکو وغیرہ کی طرح درآمد نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس صنف کی جڑیں ہمارے ملک کی تہذیبی اور معاشرتی زمین میں پیوست ہیں ہندی کے عظیم شعراء ملک محمد جائسی۔ رحیم تلسی داس، سورداس، اور کبیر داس وغیرہ نے اس صنف سخن کو اپنے عقائد و نظریات کی اشاعت کے لئے استعمال کیا۔ لیکن بعد کے شعراء (ہندی) نے اس صنف کی اہمیت و افادیت کی قدر نہ کی اور گیت چھند وغیرہ کی سمت مڑ گئے۔

ہندی کی اس نیم جان صنف شاعری کو اردو شعراء نے اپنے تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنا کر یہ ثابت کر دیا۔ کہ فنون لطیفہ کے ارتقاء اور زوال میں زبان کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ہندی دوہوں کو اردو میں برتنے والے میں جمیل الدین عالی، صہبا اختر ناوک حمزہ پوری، نادم بلخی، ندا فاضلی، پریم پاب گدمی، کاوش پرتاب گڑھی، اوم پرکاش لاغر، س ف اعجاز، بھگوان داس اعجاز، کرشن موہن۔ مظفر حنفی۔ روپ بھار دواج اور ساغر جیدی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

دوہا سنتوں اور صوفیوں کے اقوال اور نظریات نشر و اشاعت کا موثر ترین وسیلہ ہے

کبیر داس، اور تلسی داس نے اسے اپنے فلسفیانہ
خیالات کا ذریعہ اظہار بنایا۔ رحیم نے اسے محبت
وعشق کے نشیب و فراز کا مناسب ترین وسیلہ بنایا
لیکن آج اردو شعرا نے دوہے کو ہر جہت خیالات
وافکار کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے ہمارے
کچھ اردو شعرا نے اس صنف میں مخصوص لفظیات
سے پرے کے دلکش اور علامات واستعارات
کے تجربے کئے ایسے چند شعرا میں ندا فاضلی کا نام سر
فہرست ہے۔

ندا فاضلی کے یہاں دوہوں میں نئی لفظیات
اور علامات واستعارات کے کامیاب تجربے ہیں
بلکہ یوں کہا جائے کہ بعض اوقات ندا فاضلی
دوہوں کو اس طرح تخلیق کرتے ہیں کہ ہر دوہا
غزل کا منفرد مطلع محسوس ہونے لگتا ہے۔ انہوں نے
اپنی جدید و منفرد غزل کے بیشتر موضوعات کو
دوہا کے وسیلے سے پایۂ اظہار تک پہنچانے کا
خوبصورت فریضہ انجام دیا ہے۔

مثال کے طور پر

نینوں میں تھا راستہ ہردے میں تھا گاؤں
ہوئی نہ پوری یاترا، گھس گئے دونوں پاؤں

دکھ کی نگری کون سی آنسو کی کیا ذات
سارے تارے دور کے، سب کے چھوٹے ہات

میں رویا پردیس میں، بھیگا ماں کا پیار
دکھ نے دکھ سے بات کی بن چٹھی بن تار

ساتوں دن بھگوان کے کیا منگل کیا پیر
جس دن سوئے دیر تک بھوکا رہے فقیر

پنچھی بادل بھول بن، الگ الگ آکار
ماٹی کا گھر ایک ہی، سارے رشتے دار

ہنس چڑیاں دھوپ کی دور گگن سے آئیں
ہر آنگن مہمان سی پکڑو تو اڑ جائیں

راجا سینا جوڑ کے گھوما چاروں دھام
دو گز کے ایک ڈھیرے آگے بڑھا نہ نام

اس کے علاوہ ندا فاضلی کے یہاں ایسے دوہے
بھی وافر مقدار میں موجود ہیں جنہیں زبان کے اعتبار سے
ہندی کے دوہے اور خیال کے اعتبار سے اردو کے
دوہے کہنا زیادہ مناسب ہے۔ لیکن میرے ذاتی خیال
میں کسی تخلیق کو زبان کے خانوں میں رکھ کر اس کی خامیوں
اور خوبیوں کی تلاش قطعی مناسب نہیں ہے۔ یہ بات
سچ ہے کہ دوہا ہندی کی قدیم تہذیب کا نام ہے
لیکن وہی دوہا اردو میں محبت واخوت کی علامت

کی علامت بن گیا ہے۔

ندا فاضلی کے دوہے صرف محبت کا پیغام ہیں۔ امن و آشتی اور بھائی چارے کی علامت ہیں۔ ندا فاضلی کے یہاں دوہوں میں یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ وہ ایسی زبانیں جنکے بولنے والے آپس میں قتل و غارت پر آمادہ ہیں، نہایت خلوص سے ایک ہی خیال کے اظہار کا سبب ہیں

تتلی بیٹھی پھول پر، شاعر کرے وچار
دو ملکوں کے بیچ میں سرحد کی دیوار

ساگر سے ندیا ملے، ندیا ساگر ہوئے
کس میں کتنا خون ہے جانے نا ہیں کوئے

سیتا، رادن، رام کا، کریں وبھاجن لوگ
ایک ہی تن میں دیکھئے تینوں کے سنجوگ

اچھی سنگت بیٹھکر سنگی بدلے روپ
جیسے مل کر آم سے میٹھی ہو گئی دھوپ

مندرجہ بالا دوہوں میں وچار، نا ہیں، وبھاجن، سنجوگ، اور سنگت وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو اُردو کی کسی بھی اصناف شعری کے لئے اچھوت میں سمجھے جائیں گے لیکن یہ دوہے کا وصف ہے کہ اس نے اردو شاعر کے بطن سے ایسے الفاظ بھی نکال لئے جو غزل کی کائنات میں متروک ہی سمجھے جاتے۔

ندا فاضلی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے لفظوں کو خیال سے اتنا ہم آہنگ کر دیا ہے کہ ان الفاظ کے متبادل لفظ لاکھ سر پٹکنے کے باوجود نہیں ملتے اور ہمیں تھک ہار کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ ندا فاضلی نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں۔ وہی مناسب ترین لفظ ہیں۔ اور دوہوں کے مزاج کے عین مطابق بھی — لہٰذا اگر ہندی شعراء کو یہ شکایت ہے کہ اردو شعراء نے دوہے میں صرف اردو الفاظ ہی استعمال کئے، یا دوہوں کے مزاج کا خیال نہیں رکھا۔ تو یہ الزامات ندا فاضلی کے دوہے پڑھنے کے بعد قطعی بے بنیاد لگتے ہیں — اردو شعراء کی فراخدلی یہ ہے کہ انہوں نے اردو میں بھی دوہے لکھنے باوجود ان کا نام اردو دوہے نہیں رکھا جبکہ ہمارے ہندی شعراء نے غزل کو ہندی الفاظ کے ساتھ برتنے کی کوشش کی۔ اس کے مزاج کو ٹھیس پہنچائی اور اس کا نام ہندی غزل رکھدیا۔

دوہا جیسی صنف کو ندا فاضلی ایسے کچھ اور تخلیق کاروں کی ضرورت ہے۔ کاش ایسے چند فنکار اسے میسر آجاتے۔

-O-

آنکھ اور خواب کے درمیان

محسن لطیف

آنکھ اور خواب کے درمیان، ندا فاضلی کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کے دو مجموعے۔ لفظوں کا پل اور مور ناچ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ لفظوں کا پل ان کا پہلا شعری تعارف تھا۔ جو لب و لہجہ کی انفرادیت کے ساتھ فرد اور سماج کی ہم آہنگی کا غمازیہ تھا۔ اس شاعری کی گھریلو فضا، لفظی تازگی اور گنگناتی زبان نے جدید شاعری کی عام فضا سے مختلف ہوتے ہوئے بھی ناقدین کو متوجہ کیا تھا۔

لفظوں کے پل سے آنکھ اور خواب کے درمیان تک ندا کی شاعری کے تین موڑ ہیں۔ لفظوں کا پل، میں قصباتی دھوپ چھاؤں کو رنگ برنگی تصویروں سے درشایا گیا ہے۔ جبکہ مور ناچ میں ان تصویروں کو شہری انتشار و بحران کے پہلوؤں میں رکھ کر دکھایا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان تصویروں کا روپ رنگ یکسر بدلا ہوا لگتا ہے

مور ناچ کا شاعر شہری میکانکیت کی شدت آمیز نفی کرتا ہوا سماجی انارکی کی صدوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا یہاں وہ شہر میں گاؤں کی تلاش کا چلتا پھرتا البم نظر آتا ہے جس کے تحت ماضی و مستقبل دونوں مشتبہ ہیں۔ زندگی دیوانے کے خواب کی طرح بے ربط ہے اور سماجی رشتے زندگی کرنے کے محض بہانے ہیں یہ فکری رویہ شاعر کی زندگی کے اس دور کا رد عمل ہے جب بمبئی آکر یہاں بسنے کی تگ و دو سے گذر رہا تھا اُن کی بدنام نثری کتاب "ملاقاتیں" بھی اس دور کی پہچان ہے

مور ناچ میں ندا اپنی شعری لسانیات اور موضوعی برتاؤ کے نئے پن سے متاثر کرتے ہیں مگر اُن کی طنزیہ جھلاہٹ اور سماجی عدم مفاہمت آسانی سے قبول نہیں ہوتی۔ مور ناچ میں ہمیں ایک ایسے بنجارہ سے سابقہ پڑتا ہے۔ جو آکاش کی چادر اور دھرتی کے بچھونے کے ساتھ نئے نئے منظروں کا رسیا ہے۔ کسی ایک جگہ ٹھہرنے اور رکنے کو وہ زندگی کی رفتار کے منافی گردانتا ہے

لفظوں کا پل اور مور ناچ کے ان فکری و تخلیقی زاویوں کو ان کے ہی شعروں سے یوں سمجھا جا سکتا ہے

پیا نہیں جب گاؤں میں :: آگ لگے سب گاؤں میں

کتنی میٹھی تھی املی .....
ساجن تمے جب گاؤں میں
(لفظوں کا پل)

محبت میں وفاداری بھیجئے
جہاں تک ہو اداکاری بھیجئے

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو
(مور ناچ)

آنکھ اور خواب کے درمیان صرف ندا کے فکر و اظہار کی توسیع ہے بلکہ اس میں پہلے دو مجموعوں کے برعکس غزل، گیت، اور نظم کے ساتھ الفاظ کے نام سے ایک مکمل باب بھی شامل ہے۔ جس میں بائیس نثری نظمیں ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کے لہجہ میں ٹھہراؤ بھی آیا ہے۔ اور لفظوں کے نئے بھی ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں بول چال کی زبان تو وہی ہے جو ندا فاضلی کا انفرادی اسلوب ہے لیکن اب عام بول چال کے انہیں سیدھے سرل لفظوں میں وہ تہہ داریاں پیدا ہو گئی ہیں جو شعری مفہوم کو بہ یک وقت کئی سطحوں میں پھیلاتی ہیں اب شاعر نئے سرے سے انہیں ٹوٹے رشتوں اور خوابوں کو تلاش کرنے اور جوڑنے میں منہمک نظر آتا ہے جسے خود ہی اسکی ذہنی تیزابیت نے مرجھا دیا تھا۔

اس مجموعے میں، بہن بھائی کے رشتے کی پاکیزگی ماں بیٹے کے تعلق سے سنجیدگی چاہنے اور چاہے جانے کی شدت اور خدا کو زمینی مظاہر میں ڈھونڈنے کے حسن نے۔ ان کے شعری مناظر کو نئی آب و تاب کیسا تھ پیش کیا ہے۔ یہ مثبت فکری احساس صرف ندا فاضلی کے لئے ہی نہیں بلکہ آج کی یکسانیت زدہ شاعری کیلئے ایک نئی راہ کا امکان ہے۔

ندا یہاں بھی فرد کی انفرادیت کے تو قائل ہیں مگر اب اس کی تنہائی کو سماجی تناظر میں دیکھنے لگے ہیں

تنہا تنہا دکھ جھیلیں گے محفل محفل گائیں گے
جب تک آنسو پاس رہیں گے تب تک گیت سنائیں گے

یا

تم سے آوارہ اکیلے میں بھٹک جاتا ہے
جس جگہ رہیے وہاں ملتے ملاتے رہیے

ندا اب اس تصوراتی یا ناسلجھائی آسیب سے بڑی حد تک آزاد ہو چکے ہیں۔ جس نے ان کے ذہن کو زندگی کی معنویت کے قریب کر دیا تھا۔ ان نئی نظموں گیتوں

بقیہ صفحہ ۱۲۶ پر

ندا فاضلی

دو آٹوگراف کے درمیان

نجمہ احساس پاکستان

کئی سال پہلے کی بات ہے، دہلی کے ایک مشاعرہ میں ندا فاضلی کو دیکھنے اور سننے کا اتفاق ہوا تھا دبلا پتلا ایک شخص، آنکھوں میں ویرانی، چہرہ پر وحشت، گفتگو میں طنز، مزاج میں جھنجلاہٹ، پہلے تعارف میں پرانی شناسائی کا سا انداز، ہر لڑکی کے ساتھ ذو معنی جملوں کا بیوہار، اس دن انہوں نے میری آٹوگراف بک پر اپنا کوئی شعر لکھنے کے بجائے شیکسپیئر کی ایک بہت ہی مشہور لائن لکھی تھی

Life is a tale told by an idiot.

اس ملاقات کے کئی برس بعد پھر اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن اب وہ پہلے جیسے نہیں تھے آنکھوں کی ویرانی کو چشمے نے مدھم کر دیا تھا طنز اور جھنجلاہٹ میں مسکراہٹ گھلنے لگی تھی بے تکلفی کا انداز تو اب بھی وہی تھا مگر جملوں میں ذو معنویت کی جگہ اب شائستگی پیدا ہو چلی تھی۔ اس بار میں اکیلی ان کی فین نہیں تھی۔ میرے ساتھ میرا آٹھ سال کا بیٹا بھی فلمی گیتوں کی وجہ سے ان کو دیکھنے کا مشتاق تھا۔ میرے بیٹے کو آٹوگراف دیتے ہوئے جو شعر انہوں نے لکھا وہ یوں ہے

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

ان دو آٹوگرافس کے درمیان وقت کی مدت دس گیارہ سال ہونی چاہیے۔ اس عرصہ میں وہ اپنے شعری سفر کے لحاظ سے لفظوں کا پل اور مور ناچ سے گزرتے ہوئے اپنے تیسرے شعری مجموعہ آنکھ اور خواب کے درمیان تک پہونچ چکے ہیں پہلی ملاقات کے وقت شاید ان کے پہلے مجموعے "لفظوں کا پل" کو منظر عام پر آنے میں چند ماہ کی دیر تھی۔ گوالیار میں ان کے اچانک گھر سے بے گھر ہو جانے کا سانحہ نیا نیا تھا "لفظوں کا پل" کے انتساب میں ندا نے اس طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ سیاستوں کی آنکھ مچولی نے ۱۹۶۵ء

میں، یعنی آزادی کے اٹھارہ سال بعد اُن کی پوری فیملی (جو والدین سمیت کئی بھائی بہنوں پر مشتمل تھی) کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا ندا اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان کیوں نہیں گئے؟ اس سوال کا جواب لفظوں کا پل، میں شامل ان نظموں اور غزلوں میں پوشیدہ ہے۔ جو اپنے گھریلو جزئیات اور نچلے متوسط طبقے میں رشتوں کی نفسیات کی بنا پر کافی مشہور ہوئی تھیں۔ ان میں بار بار ایک ایسی پردہ نشین دوشیزہ کی تصویر ابھرتی محسوس ہوتی ہے جو کھڑکی جھانکتی ہے چھت پر گیلے بالوں کو سکھاتی ہے کچن میں سالن پکتی ہے اور جہاں باپ کی نظریں بچا کر ڈرتے جھجکتے کسی کونے کھدرے میں ذرا دیر کو ملتی ہے۔ اور دونوں دور رہتی ہے اس کھٹے میٹھے رومانس کو ندا نے ننھے رنگوں سے سنوارا ہے۔ انداز بیان کی شوخی اور گھریلو فضاؤں کی مانوس جھلکیوں نے ان تخلیقات میں البم کی تصویروں جیسا رنگ بھر دیا ہے جن میں بنے ہوئے لمحے اپنی حرارت اور گرمی کے ساتھ سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں۔ اس رومانس کی شروعات کا ایک منظر دیکھیے۔

آمنے سامنے دو نئی کھڑکیاں
جلتی سگریٹ کی لہراتی آواز میں
سوئی ڈورے کے رنگین الفاظ میں
مشورہ کر رہی ہیں کئی روز سے

اس رومانس کی ہیروئن کے چہرہ مہرہ اور عمر کے بارے میں بھی یہاں واضح اشارے ملتے ہیں

کھلکھلاتے رو پہلا دن تو سارا
کہیں سے رات کھوئی ہو گئی

تکلف سے پرے ہے اب بھی لہجہ
نگاہوں میں وہی ہے بانکپن
وہی ہے ناپ اس کی چوڑیوں کا
اشاروں میں وہی گولائیاں ہیں
وہ باتیں اب بھی کرتی ہے برابر
مگر آواز موٹی ہو گئی ہے

لیکن افسوس ہے یہ رومانی فضا بہت دور تک ندا کا ساتھ نہیں دے سکی۔ یہ رومانس جس انجام تک پہنچا اس کی ایک جھلک ندا کی نظم پھر یوں ہوا۔ میں یوں ہے۔

کچھ دن خطوں میں آنسو بہے شور غل ہوا
تم زہر پی کے سوئیں میں انجن سے کٹ گیا

پھر یوں ہوا کہ دھوپ کھلی ابر چھٹ گیا
میں نے وطن سے کوسوں پرے گھر بسا لیا
تم نے پڑوس میں نیا بھائی بنا لیا

ندا کا یہ پہلا مجموعہ ان کے بدلے ہوئے ذہنی و اقتصادی حالات کے مطابق دو دائروں میں بٹا ہوا لگتا ہے۔ پہلے باب میں ان غزلوں نظموں اور گیتوں کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ جو فطرت اور زندگی کی ہم آہنگی سے عبارت ہیں، چھوٹے شہروں کے مانوس راستے، پردوں سے جھانکتے چہرے لاابالی صبحیں، بے فکر شامیں، چنچل طبیعتیں۔ نفرتیں محبتیں، ایک چھوٹی سی خوبصورت دنیا ہے جس کے تجرباتی حسن اور زمینی مزاج نے سیدھی سادھی باتوں میں شعریت کا جادو جگایا ہے۔ اسی مجموعے کے دوسرے حصہ میں وہ چیزیں شامل ہیں جن کا تعلق ان ذہنی کیفیات سے ہے۔ جو ان کی زندگی کے اہم سانحہ کا ردعمل ہیں یعنی گھر سے اچانک بے گھر ہو جانے کا سانحہ جو نئے استاروں اور پیکروں میں ان کی نظموں اور غزلوں میں بار بار ظاہر ہوتا ہے۔ اس دکھ کو ندا شاید آج تک نہیں بھول پائے ہیں۔

شہر تو بعد میں ویران ہوا
میرا گھر خاک ہوا تھا پہلے

گھر سے چلے تھے پوچھنے موسم کا حال چال
جھونکے ہوا کے بالوں میں چاندی پرو گئے
ہر سمت سے ٹٹول ہر اک زاویے سے دیکھ
میرا ابھی ہاتھ آئے تو کنکر بنا کے چھوڑ
جانے کیا کیا بول رہا تھا سرحد پیار، کتابیں خون
کل میرے بستر پر تھک کر ٹوٹ رہا تھا جھاگ کون

یہ تھے وہ ندا فاضلی جن سے میری پہلی ملاقات دس بارہ سال پہلے ہوئی تھی۔ پہلے اور اب کے ذہنی رویوں کا فرق آنکھ اور خواب کے درمیان کے صفحات پر بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ ندا کا تخلیقی ذہن وقت کے ساتھ مسلسل بدلتا رہا ہے اور یہ بھی ان کی شعری زندگی کا جواز بھی ہے وہ کسی زخم کو ناسور کی طرح پالنے کے بجائے اس کے اندمال کے زیادہ قائل ہیں۔ انھوں نے چھوٹے بڑے ہر حادثہ کو تجربہ کی صورت قبول کیا ہے، یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ عمر اور تجربہ کے ساتھ ان کے انفرادی غم زیادہ دلدوز گہرے ہو کر دوسروں کے سکھ درد سے رشتہ جوڑنے

لگے ہیں۔ ندا کے یہاں سماج اور فرد کا ٹکراؤ
ہمیشہ اور ذہنی رہا ہے۔ ذات کے نہاں خانوں
میں زندگی کی بے معنویت کی مرثیہ گوئی کی جگہ
جیتے جاگتے معاشرہ میں معنی کی جستجو ان کے تخلیقی
عمل کی پہچان ہے۔ اس شاعری میں عام فیشن کی
طرح خرگوش، مینڈک یا سمندر آسیب آدمیوں کی
علامت نہیں بنتے بلکہ مسائل خود زندگی کی پیچیدگیوں
کا آئینہ بنتے ہیں۔ یہ شعری رویہ ندا کو لوک ادب اور
اس کی عظیم تہذیب سے ہم رشتہ کئے ہوئے ہے
جو انہیں، ان کے دیگر ہم عصروں سے جدا اور
ممتاز کرتی ہے۔ یہ شاعری اپنے چہرے مہرے اور
حسیت کے اعتبار سے جدید بھی ہے۔ اور سننے
اور پڑھنے والوں کے نزدیک بھی ہے۔ عام جدید
شاعری کو دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ عجیب سی محسوس
ہوتی ہے۔ لیکن اس عجیب بات کی وجہ سے ندا کا
شمار چند شعرا میں ہے جو آج کے مقبول نام ہیں۔
'آنکھ اور خواب کے درمیان' ندا کا نیا شعری
مجموعہ ہے اس میں نظموں اور گیتوں کے مقابلہ
میں غزلوں کی تعداد زیادہ ہے غزل جیسی نازک
اور کلاسیکی صنف کی طرف ان کا جھکاؤ بھی اسی

تبدیلی کا اشارہ ہے۔ جس کی طرف میں نے شروع
میں اشارہ کیا ہے۔ غزل اپنے صنفی مزاج کے
لحاظ سے بولتی کم ہے اور سوچتی زیادہ ہے اس
میں واقعہ کی وضاحت سے نہیں بلکہ ردعمل کے
ارتکاز سے بات بنتی ہے وقت اور واقعہ کا وہ
درمیانی وقفہ جو سوچ کے اکہرے پن میں سماجی و
تہذیبی تہیں پیدا کرتا ہے اب ان کے شعروں کا
حسن ہے ان غزلوں کا انداز، موضوعی برتاؤ
اور اشاراتی ترتیب و تنظیم، مور ناچ کی اکثر
غزلوں سے مختلف ہے۔ مور ناچ کی اکثر غزلوں سے
شعروں کے تقابل سے یہ بات زیادہ واضح صورت
میں سامنے آتی ہے۔ (میں نے یہاں نظموں کا
پُل کا ذکر اس لئے نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں بعد کے
دونوں مجموعوں کے مقابلہ میں غزلیں نہ ہونے کے برابر ہیں

محبت میں وفاداری سے بچئے، جہاں تک ہو اداکاری سے بچئے
شرافت آدمیت اور دردمندی، بڑے شہروں میں بیماری ہے بچئے

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

دشمنی لاکھ سہی، ختم نہ کیجئے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے، ہاتھ ملاتے رہیے

مجھے ان شعروں یا اس قسم کے دوسرے اشعار کی تازہ کاری اور تجرباتی خلوص سے انکار نہیں۔ لیکن اظہاری سطح پر یہ شعوری ردعمل کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے۔ ان میں احساس بھی ہے فکر بھی ہے اظہار کی پرکاری بھی ہے۔ مگر ان سب کے باوجود یہ سخن ماورائے سخن کی حدوں تک چھونے سے گریز کرتے ہیں آنکھ اور خواب کے درمیان میں شامل کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اس کو رخصت تو کیا تھا مجھے معلوم نہ تھا
سارا گھر لے گیا گھر چھوڑ کے جانے والا

تم جو سوچو وہ تم جانو ہم تو اپنی کہتے ہیں
دیر نہ کرنا گھر جانے میں ورنہ گھر کھو جائیں گے

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو
چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں گے

اک آنکھ سے ہنستی ہے یہ اک آنکھ سے روتی ہے یہ
جیسی دکھائی دے جسے اس کی وہی ہے زندگی

اس نئے مجموعے میں نہ صرف ندا فاضلی کی آواز گہری اور سنجیدہ ہوئی ہے۔ ان کی شعری کائنات کا رقبہ اور جغرافیہ بھی داخلی و خارجی عوامل کے امتزاج و اشتراک نے اب ان کی شاعری کو منطقی و استدلالی نتائج سے دور کر کے نئے جمالیاتی افقوں سے ہمکنار کر دیا ہے۔

اس مجموعے میں بھی ندا کا اظہار تو اس طرح کا سوانحی ہے جس کے ہلکے گہرے نقوش ان کے یہاں پہلے بھی ملتے ہیں لیکن اب اس سوانح کا دائرہ انفرادی غم تک محدود نہ ہو کر روایت، جنگ، خدا تاریخ و مذہب تک پھیل چکا ہے اس پھیلاؤ نے ان کے شعری ذہن کو نئی جہتوں سے روشناس کیا ہے۔

والد کی موت پر ایک نظم، نئے گھر پہلی نظم خدا گھر نہیں کوئی، انتظار، بیٹے کا سفر، گھر ایک ستارہ اور ایسی ہی دوسری نظمیں اس مجموعہ کا اعتبار بھی ہیں۔ اور ہمارے عہد میں روایت و جدت کے متوازن رد و قبول کا شعری اظہار بھی ہیں

ندا کی شاعری جدید شاعری کے نئے امکانات کی شاعری ہے۔ اس کی جانچ پرکھ کے لئے رائج فارمولوں سے مدد لینے کے بجائے خود انہیں کی شعری اقدار سے تعاون حاصل کرنا چاہیے۔ بشکریہ

ندا فاضلی - ہجرتوں کا شاعر

احتشام اختر

ندا فاضلی سے میری پہلی ملاقات بمبئی میں
تصدیق سہاروی مرحوم کے مکان پر ہوئی تھی۔ یہ
سنہ ۱۹۶۸ء کی بات ہے۔ ندا فاضلی تصدیق صاحب
کے ہاں ان دنوں مقیم تھے۔ اس کے احمد آباد
میں سرشار بلند شہری کے مکان پر دوسری ملاقات
ہوئی۔ اور پھر اس کے بعد ندا علی گڑھ آئے تو
وہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ اور پھر تو مشاعروں
میں ان سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ندا فاضلی
پہلی ہی ملاقات میں گھل مل جاتے ہیں۔ بڑی بے تکلفی
اور تپاک سے ملتے ہیں۔ ان کے لہجے میں بہت ہی
بے ساختہ پن ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے سینئر شاعر ہیں
لیکن انھیں میں نے ہمیشہ تم کہکر مخاطب کیا ہے
اور انہوں نے اس کا برا نہیں مانا۔ ان سے
گفتگو کرتے وقت ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے
گویا ہم اپنے ہم عمر بے تکلف دوست سے بات
کر رہے ہیں۔ ان کی فقرے بازی کی عادت
اور بذلہ سنجی بھی ان سے قربت اور بے تکلفی کا
سبب بن جاتی ہے۔ ادبی اور غیر ادبی حلقوں میں
ان کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ ان خوبیوں
کے باعث وہ مشاعروں میں نظامت کے فرائض
بھی بہت خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں
مشاعروں میں ندا فاضلی تحت اللفظ پڑھتے
ہیں پھر بھی کامیاب رہتے ہیں۔ اس کی وجہ
ان کا بے ساختہ اور بے تکلف انداز بیان
اور انداز پیشکش ہے۔

تقریباً تین سال قبل بمبئی جانے کا پھر
اتفاق ہوا۔ وہاں میں ممتاز راشد کے ساتھ
ندا فاضلی کے مکان گیا (کیونکہ ممتاز راشد
کو ندا کے مکان کا پتہ معلوم تھا) سنہ ۱۹۶۸ء کے
ندا فاضلی میں اور اب کے ندا فاضلی میں زمین
آسمان کا فرق تھا۔ ایک اچھا سا فلیٹ، ٹی وی
فرج کھانا پکانے کی گیس، ٹیلیفون اور کار
غرضیکہ آسائش اور عشرت کی ہر شے ندا کے پاس
تھی۔ سنہ ۱۹۶۸ء میں ندا فاضلی بے روزگار اور پریشان

حال تھے۔ بے زیب زینت گھر یا کمرہ بکھرے بکھرے
الجھے ہوئے بال۔ لیکن اب ان کے سر سے
بکھرے بال غائب ہو چکے تھے یعنی اب ندا
آسودہ حال اور فارغ البال ہو گئے تھے
اور یہ کہاوت صحیح ہو گئی تھی۔ کہ جس کا سر گنجا
ہوتا ہے وہ مالدار اور آسودہ حال ہوتا ہے
ندا فاضلی کو اب فلموں میں گیت لکھنے کا کام مل
گیا تھا۔ لیکن یہ کام برسوں کی جدوجہد کے بعد
ملا تھا۔ اس سے ان کی ثابت قدمی اور صبر و
استقلال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس میں
کوئی شک نہیں کہ ندا فاضلی نے کچھ فلمی گیت بہت
خوبصورت لکھے ہیں۔ ان گیتوں میں انھوں نے
شعری معیار بھی برقرار رکھا ہے مثلاً

تو اس طرح سے مری زندگی شامل ہے
یہاں کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
تمہارے ہونٹوں کی خامشی میں یہ کیا چھپا ہے
اشارے جیسا۔

یہ گیت معیاری بھی ہیں اور پُر اثر بھی
فلم کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اور
ڈائرکٹر کی فرمائش اور ہدایت کا خیال
کرتے ہوئے معیاری گیت لکھنا واقعی بہت
مشکل کام ہے۔

میں نے ندا کے فلیٹ میں بیٹھے ہوئے
یہ بات شدت سے محسوس کی کہ فلمی گیت لکھنے کی
وجہ سے ان کی مالی حالت تو اچھی ہو گئی تھی۔ لیکن
ایک چیز سے اب بھی ان کا پیچھا نہیں چھوٹا تھا۔ وہ
تھی ان کی دیرینہ تنہائی۔ تنہا تنہا دکھ جھیلنے کا
انداز اب بھی برقرار تھا۔ ندا فاضلی اپنے آبائی گھر کو
بہت پہلے چھوڑ چکے تھے۔ اور ان کے رشتہ دار
اور والدین ہجرت کر کے پاکستان جا چکے تھے
اس کا اشارہ انھوں نے لفظوں کے پل
کے دیباچے میں بھی کیا ہے۔ لیکن اور شخص جس کی
وجہ سے ان کی تنہائی دور ہو سکتی ہے وہ ابھی
تک ان کی زندگی میں نہیں آیا ہے۔ یعنی انھوں نے
ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ شادی کی بڑی برکتیں
ہیں۔ ازدواجی زندگی کی ان برکتوں اور
راحتوں سے ندا فاضلی اب بھی محروم ہیں۔ زندگی
کی دشوار گزار راہوں کی ہم سفر، شریک غم
رفیقۂ حیات، ابھی تک ان کی زندگی میں داخل
نہیں ہوئی ہے۔ تنہائی کے اس شدید احساس کی

کارفرمائی ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے ؎

اس کو رخصت تو کیا تھا مجھے معلوم نہ تھا
سارا گھر لے گیا گھر چھوڑ کے جانے والا

شہر تو بعد میں ویران ہوا
میرا گھر خاک ہوا تھا پہلے

تم جو سوچو وہ تم جانو۔ ہم تو اپنی کہتے ہیں
دیر نہ کرنا گھر جانے میں ورنہ گھر کھو جائیں گے

ندا فاضلی کی شاعری سے میں ان سے ملنے سے بہت پہلے متعارف ہو چکا تھا۔ ان کا کلام میں رسائل میں تلاش کر کے پڑھتا تھا۔ ان کے کلام میرے لئے کشش تھی۔ اس لئے کہ ندا کے کلام میں رومانیت کی چاشنی ہوتی ہے اور میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے۔ کشش کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ ندا فاضلی کی شاعری پر ہندی اسلوبیات کا گہرا اثر ہے۔ ہندی کے کلاسکی شعراء کے علاوہ ندا نے ذاتی طور پر سوم ٹھاکر اور ادم پربھاکر کا بڑا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ ندا فاضلی کا اسلوب سادہ اور آسان ہے اور اُن کی شاعری کے استعارات اور تشبیہات ہندی شاعری کی تشبیہات اور استعارات سے بہت قریب ہیں یہی وجہ ہے کہ ندا کا کلام اردو رسائل و جرائد کے ساتھ ہندی کے رسالوں میں بھی پابندی سے شائع ہوتا رہا ہے۔

منظر نگاری اور جزئیات نگاری ندا فاضلی کی نظموں کی نمایاں خصوصیت ہے لیکن یہ جزئیات نگاری مثنوی کی منظر نگاری اور جزئیات نگاری سے مختلف ہے۔ واقعہ اور منظر کی تفصیل یا جزئیات ندا کے ہاں استعاراتی اور علامتی نوعیت کی ہوتی ہے۔ گرد و پیش کی ہر شے ہر شے ندا فاضلی کی نظموں میں استعارہ اور علامت بن جاتی ہے

؎ آمنے سامنے دو نئی کھڑکیاں
جلتی سگریٹ کی لہراتی آواز میں
سوئی ڈورے کے رنگین الفاظ میں
مشورہ کر رہی ہیں کئی روز سے
شاید اب
بوڑھے دروازے سر جوڑ کر
وقت کی بات کو وقت پر مان لیں
کی ٹوٹی پھوٹی گلی چھوڑ کر
کھڑکیوں کے اشاروں کو پہچان لیں

(دو کھڑکیاں)

ندا فاضلی نے نظمیں بھی لکھی ہیں غزلیں بھی لکھی ہیں دوہے اور گیت بھی لکھے ہیں۔ اور گیتوں کو ندا نے نیا لہجہ اور نئی زبان دی ہے۔ اگرچہ گیت کا کینوس بہت محدود ہے۔ اس کے باوجود ندا فاضلی نے اس صنف سخن میں جدت اور تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور وہ اپنی اس جستجو میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اسی طرح دوہے کی صنف کو بھی انہوں نے نیا آہنگ اور بانکپن عطا کیا ہے۔ ندا فاضلی نے ہندی شاعری سے براہ راست استفادہ کیا ہے اور استفادہ کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ اردو دوہے کو ہندی دوہوں کے وزن و آہنگ اور اسلوب سے قریب تر کرنے میں سفل ہوئے ہیں۔ غزل کی صنف میں بھی ندا فاضلی نے ندرت و طرفگی اور جدید حسیت پیدا کی ہے طوالت کے خوف سے دوہے اور گیتوں کی مثالیں یہاں پیش کرنا ممکن نہیں۔ البتہ غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجے رشتہ

دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

کچھ بھی بچا نہ کہنے کو ہر بات ہو گئی

آؤ کہیں شراب پئیں رات ہو گئی

نقشہ اٹھا کے کوئی نیا شہر دیکھیے

اس شہر میں تو سب سے ملاقات ہو گئی

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو

چار کتابیں پڑھکر یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں گے

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کرلیں

کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

جدید شاعری بڑے شہروں کی شاعری ہے جدید شاعری جدید سائنسی دور کی ترجمان ہے اور جدید سائنسی دور کی تصویریں بڑے شہروں میں نظر آتی ہے بڑے شہروں کی شاعری کی روشن مثال ندا فاضلی کی شاعری ہے۔ ندا کی شاعری میں بمبئی کا عکس نظر آتا ہے بمبئی میں ندا فاضلی بہت عرصہ سے مقیم ہیں بمبئی کو ندا نے بہت قریب سے دیکھا ہے بمبئی کی امیری اور غریبی بمبئی کے سلمز اور فلک بوس عمارتیں بمبئی کا شور شغب اور فضائی آلودگی اور سمندر کی لہریں غرضیکہ ندا نے بمبئی میں یہ سب کچھ قریب سے دیکھا ہے اور شدت سے محسوس کیا ہے اسی لئے ندا فاضلی کی شاعری بمبئی کے صنعتی کلنیکی اقتصادی اور سماجی مسائل کی صحیح ترجمانی کرتی ہے

فضا میں گونج رہی ہیں ہزاروں آوازیں
سلگ رہی ہیں ہواؤں میں ان گنت سانسیں
جدھر بھی دیکھو
کھرے کوٹھے نیند لیاں ٹانگیں
یہاں تو سب ہی بڑے چھوٹے
اپنے چہروں کو
چمکتی آنکھوں کو گالوں کو ہنستے ہونٹوں کو
سروں کے خول سے باہر نکال لیتے ہیں
سویرے اٹھتے ہی پیروں میں ڈال لیتے ہیں

عجیب بستی ہے اس میں نہ دن نہ رات نہ شام
بسوں کی بیچ سے سورج طلوع ہوتا ہے
جھلستی ٹین کی کھولی میں چاند سوتا ہے

(بمبئی)

علی گڑھ میں ایک بار میں نے ایک مشہور شاعر سے پوچھا کہ ندا فاضلی کی شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا کہ ندا فاضلی کی شاعری کا کینوس بہت محدود ہے۔ وہ رومانی شاعر ہیں اور رومانی شاعری میں [illegible] وسعت نہیں ہوتی لیکن یہ رائے صحیح [illegible] ضلی کی شاعری میں حسن کی لطا[illegible] او[illegible] وفا شعاری نہیں ہے

ان کے ہاں جنسی پہلو پر زیادہ زور ہے ندا فاضلی کی شاعری میں ہمیں رومانی سے زیادہ انٹی رومانی رویہ نظر آتا ہے۔ عورت اور مرد کا جنسی اختلاط اور عورتوں کا ہم جنسی کا رجحان ان کی شاعری میں بہت نمایاں ہے ؎

پہلے وہ روپ تھی پھر رنگ بنی
رنگ سے پھر جسم میں تبدیل ہوئی
اب وہ بستر بن کر
گھر کے کونے میں پڑی رہتی ہے
جس کو کمرے کا گھٹا سناٹا
وقت بے وقت اٹھا لیتا ہے
کھول لیتا ہے بچھا لیتا ہے

اسی طرح عورتوں کے ہم جنسی کے رجحان کی ایک جھلک دیکھیے

ہنسی ہنسی میں اک دوجے پر
بدلی بن بن یوں ٹوٹیں
آئے جیسا کس کر گوندھیں
کبھی جگہ سے ٹوٹیں پھوٹیں

(دو سہیلیاں)

ندا فاضلی نے نثر بھی لکھی ہے ان کی کتاب

ملاقاتیں ادبی حلقوں میں مقبول ہوئی تھی ملاقاتیں
انٹرویو پر مشتمل ہے۔ یہ انٹرویو کتابی شکل شائع
ہونے سے قبل بہت روز بلٹز بمبئی میں قسطوار شائع
ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ندا نے کچھ تنقیدی مضامین
بھی لکھے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں
اور ان کی پہچان نثر نگاری یا تنقیدی مضامین
نہیں بلکہ ان کی شاعری ہے۔

مدھیہ پردیش کے لوگوں کو اور خاص طور
پر اہل گوالیار کو اس بات پر فخر ہونا چاہیے
کہ ندا فاضلی جیسے شاعر کا ان کے شہر سے رشتہ ہے
حالانکہ خود ندا فاضلی گوالیار کو اپنی جائے پیدائش
نہیں مانتے ہیں۔ وہ دُبائی کو اپنی جنم بھومی مانتے
ہیں۔ خیر کچھ بھی ہو۔ گوالیار میں انھوں نے ایک
طویل عرصہ گزارا ہے۔ ڈبائی سے گوالیار آئے
گوالیار سے بمبئی تک ندا فاضلی نے اپنی زندگی اور
شاعری کا طویل سفر طے کیا ہے انھوں نے
ایک شہر سے دوسرے شہر کئی بار ہجرت کی ہے
ان ہجرتوں کے سفر میں دکھوں کے ساگر
اور آگ کے دریا پار کئے ہیں اور اس کے لئے
انھوں نے لفظوں کے پل بنائے ہیں۔ ندا فاضلی
نے اپنی شاعری سے بہت کام لیا ہے یا میر کے
الفاظ میں کہیں تو انھوں نے ناکامیوں سے
کام لیا ہے۔ شاعری کے ذریعہ انھوں نے
انسانی رشتوں کو استوار کیا ہے۔ اور
اقدار کے کھوکھلے پن کو اجاگر کیا ہے۔ ندا فاضلی
ایک ایسا خانہ بدوش بنجارہ شاعر ہے جو قریہ در
قریہ شہر در شہر محبت اور انسانیت کے گیت
گاتا ہے۔ ○

جدید ذہن کا بہترین ترجمان

سہ ماہی فنکار دھنباد

مدیر :۔ اکرام الحق انصاری

معاون مدیر :۔ راشد انور راشد

رابطہ

بھیا گوبند پور دھنباد

اولڈ ہزاری باغ روڈ جوبا بھٹہ
پوسٹ میڈیکل کالج رانچی پٹنہ بہار

شکیل گوالیاری

ندا فاضلی اور گوالیار

وقت کے ساتھ پرانی یادوں پر بھی دھند لکے چھانے لگتے ہیں لیکن کچھ یادیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے نقوش کبھی نہیں مٹتے انھیں میں سے کچھ یادیں ندا فاضلی کے ساتھ وابستہ ہیں، جب وہ گوالیار میں تھے۔ ندا فاضلی کا جب بھی گوالیار آنا ہوتا ہے وہ اپنے قیام کے لئے رنجیت ہوٹل کو ہی کیوں پسند فرماتے؟ یہ سوال ایک ناواقف شخص نے مجھ سے کیا اور میں اب سے بیس تیس سال پہلے کے گوالیار کی یادوں میں کھو گیا۔ رنجیت ہوٹل سے ندا فاضلی کا کیا رشتہ ہے؟ وہی جو کسی مسافر کا اپنے گھر سے ہو سکتا ہے۔ رنجیت ہوٹل بہ الفاظ دگر میخانہ — گھر اور کوچۂ قاتل ایک ہی صف میں آراستہ ہو کر ندا کے سامنے ان کے ماضی کی متحرک تصویریں پیش کرتے ہیں اور ندا کو ان کے وجود کا احساس دلاتے ہیں

نئی سڑک جو ندا کی شاعری کی طرح آج تک نئی ہے۔ اُن کی راہ میں آنکھیں بچھائے برسوں انتظار میں رہتی ہے۔ جب کبھی دو چار دن ایسے آتے ہیں، جب انھیں سن شیڈ کے سامنے پان کی دو دکان پر دوستوں اور جاننے والوں کے درمیان اسی پرانے والہانہ انداز میں قہقہے لگاتے ہوئے دیکھ پاتی ہے

ندا گوالیار سے دور ضرور ہو گئے ہیں۔ لیکن یہاں وہ سب کچھ اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ جو انہوں نے یہاں کے شعری اور ادبی ماحول کو دیا۔ تاہم ایسا ضرور محسوس کیا جاتا ہے کہ نئی سڑک کی وہ چھچھاتی ہوئی شامیں اور گنگناتی ہوتی راتیں ندا کے دامن سے لپٹی ہوئی ان کے ساتھ روانہ ہو گئیں۔ ندا نے گوالیار چھوڑنے سے قبل یہاں رہ کر جو صعوبتیں جھیلیں مصائب برداشت کئے وہ انہیں کا حوصلہ اور استقلال تھا وہ ایک شخص تھا جو پاجامے کے پائینچے چڑھائے ہوئے ایک سنیما ہال پر اس جستجو میں دیکھا گیا تھا کہ اگر موقع لگ جائے تو کچھ ٹکٹ خرید کر بلیک کئے جائیں تا کہ دو وقت کی روٹی کا گذارا ہو سکے۔ اس وقت وہ ایک ہندوستانی فنکار کی زندگی کا مشاہدہ

بہت قریب سے کر رہا تھا — ندا کو حالات نے بمبئی پہونچایا۔

فنکار کے تجربات کبھی ختم نہیں ہوتے اب نئے تجربات ندا کے سامنے تھے جن سے لوگ بخوبی واقف ہونگے۔ جو بمبئی میں ندا کے قریب رہے ہیں میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ گوالیار کے دوران قیام میں انہوں نے نامساعد حالات میں خود بھی زندہ دلی اور حوصلہ بندی کا ثبوت دیا۔ اور اپنے ہمجولیوں کو بھی زندگی کی خوشگواریاں بانٹتے رہے۔ جینے کا احساس دلاتے رہے۔ اُن کی زندہ دلی اور خوش مزاقی بھولنے اور بھلائے جانے کی چیز نہیں چند یادداشتیں کچھ اس طرح صفحۂ ذہن پر ابھرتی ہیں

بعض لوگوں کا خیال تھا ندا شاعری کے علاوہ کسی سبجیکٹ میں سنجیدہ نہیں۔ اچھا خاصہ ہنسی مزاق چل رہا ہوتا جہاں کسی نے کہا شعر سنو کہ ندا سنجیدہ ہوئے ایک دو شعر سننے کے بعد دیکھا کہ واقعی شاعری ہو رہی ہے تو سنجیدگی برقرار رہی۔ ورنہ پھر وہی غیر سنجیدگی ہنسی مذاق ٹھٹھا۔ ایک مرتبہ شہپوری سے آئے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے شاعر نے شعر سنایا۔ جس میں قفس اور صیاد کی بات خالص روایتی انداز میں کہی گئی تھی۔ ندا نے نہایت مؤدبانہ لہجے میں شاعر صاحب سے دریافت کیا۔ حضرت آپ کونسے پرندے ہیں۔ کوا، طوطا، بٹیر پھر کیا تھا قہقہوں کا ایک شور برپا ہوا اور شاعر تلملا اٹھا اور دعا صاحب سے اپنے تعلقات کی دہائی دیتا ہوا چلا گیا۔ جہاں لوگ دعا صاحب کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ ندا کا نام سنتے ہی بدک جاتے تھے ایک صاحب کا قصہ ہے وہ دعا صاحب کو شعر سنا رہے تھے۔ دعا صاحب نے کسی شعر پر داد دیتے ہوئے فرمایا۔ "کیا حکیمانہ شعر ہے"۔ اندر سے آواز آئی بابو جی ذرا ان سے ان کا تعلیمی منظر تو معلوم کیجئے یہ ندا کی آواز تھی —— ایک صاحب نے شعر سنایا جس میں مرضِ لادوا کی تمنا کی گئی تھی۔ شعر سن کر ندا نے ان کے ساتھ ہمدردی جتانا شروع کی مرضِ لادوا کو کینسر کہہ کر اس موذی پر ایک اچھا خاصہ لیکچر ان صاحب کو پلا دیا اور وہ صورت دیکھتے رہ گئے۔

لوگ اسے غیر سنجیدگی کہتے تھے اور سوچتا تھا اس سے بڑھکر شاعری کے بارے میں سنجیدہ گفتگو اور کیا ہوگی۔

ایک واقعہ جو میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ قارئین کی تفریح طبع کے لئے تحریر کئے دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے۔ اس واقعہ سے قارئین محظوظ ہی نہیں ہونگے بلکہ اپنے محبوب فنکار کے نفسیاتی پہلو کو بھی دیکھ سکیں گے۔ وہ واقعہ یہ ہے۔ نئی سڑک کے اس پار ایک گلی میں ہیجڑے رہتے تھے۔ ان میں سے کسی کے یہاں ایک تقریب پر سینکڑوں ہیجڑے جمع ہوئے۔ ہر شب جلسے ہوتے ان میں سے ہر ایک اپنا فن پیش کرتا۔ ایک شب میں نے دیکھا۔ ندا پنجوں کے بل کھڑے ہو کر ہیجڑے کا ناچ دیکھ رہے ہیں۔ میں بھی جا کر کھڑا ہو گیا ندا بولے "آج سارے شاعر کہاں مر گئے۔ دیکھو تو کیا کلاکاریاں دکھا رہے ہیں ہیجڑے"۔ اتنے میں ایک ہیجڑا آیا اور اس نے اعلان کیا کہ وہ غالب کی غزل سنائے گا۔ غالب کے نام کے ساتھ کئی القاب و آداب بھی جوڑے۔ یہ اعلان سن کر ندا نے ایک موٹی سی گالی دے کر کہا ...... نے ہیجڑوں کو بھی محروم نہیں چھوڑا۔ اس کے بعد میں اور شاید ندا بھی یہی سوچتے رہے کہ آخر جاہلوں کے اس مجمع میں ہیجڑا غالب کی کونسی غزل سنائے گا

پہلے رقص ہوا۔ وہ ہیجڑا بلیوں اچھلا۔ بڑی دیر تک اچھل کود کے بعد اس نے غزل شروع کی جس کا وہ مصرعہ ہے "بیکار جگر سر کی قسم کھا کے ہوئے ہم" ہم لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ واقعی بقول فراق "غالب بڑا پاجی شاعر تھا"۔ میرے لئے تو یہ قصہ یہیں ختم ہو گیا۔ لیکن دوسرے دن صبح جب میں نئی سڑک سے گذرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ریسٹورنیٹ کے باہر ندا اس ہیجڑے کے روبرو سراپا عجز و نیاز بنے ہوئے ہیں۔ چائے کے ساتھ اس کی خاطر تواضع فرما چکے ہیں۔ اب پان پیش فرما رہے ہیں۔ ہر آنے جانے والے کو روک کے ہیجڑے کا تعارف پیش کرتے جاتے ہیں اور اس شخص کو اس کی کم نصیبی کا احساس دلاتے جاتے ہیں کہ وہ رات ہیجڑوں کے جلسے میں نہ تھا۔ قریب ہی مسجد کے امام نجیب اللہ صاحب کو بھی روک کر ندا نے وہی روداد سنائی اور وہ بیچارے ندا کا منہ دیکھتا رہا۔ ہیجڑا تھا کہ شرم سے دہرا ہوا جا رہا تھا اور ندا سے کہہ رہا تھا۔ حضور یہ سب آپ کا حسن نظر ہے۔ ورنہ ناچیز کس قابل ہے۔ بڑی دیر تک یہ تماشہ رہا حتیٰ کہ میں دفتر جانا بھول گیا۔

ندا کی اس بیباکی اور زندہ دلی میں ایک کشش
تھی کہ شام ہوتے ہی شہر بھر کے شاعر اور ادبی ذوق
رکھنے والے نئی سڑک کی طرف کھنچے چلے آتے اگر کہیں
مشاعرہ اور ادبی نشست کا اہتمام ہوتا تو پہلے لوگ
یہیں جمع ہوتے۔

ندا کے ہم مشرب لوگوں میں شمیم فرحت
نثار پرویز اور وقار صدیقی تھے۔ شمیم اور نثار
دونوں ہی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان میں سے
ہر ایک عصری مسائل پر گہری نظر رکھتا تھا لیکن
ندا نے اپنی شاعری کے لئے اس انسان کو
تلاش کر لیا تھا جو آج کے ہر ٹوٹے ہوئے آدمی
کے اندر جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس انسان کے
گرد و پیش بکھری ہوئی چیزیں ندا سے اسطرح
ہم کلام ہوتی تھیں جس طرح قصوں میں جڑی
بوٹیوں کا حکیموں سے بولنا اور بات کرنا مشہور ہے
اس چیز نے اپنے قدیم محور سے نہ ہلنے دیا بزرگ
شاعروں کو بھی ندا کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اور انہیں
بھی پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آنے لگے تھے۔

ندا نے ملازمت کو پسند نہیں کیا لیکن بعض
اوقات مجبوری نے انہیں لیو وکینی کے حوالے
بھی کر دیا۔ اور ظاہر ہے وہ قلیل مدت ختم ہو جانے
کے بعد ندا پھر سڑکوں پر نظر آنے لگے۔ ایک دو
مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ندا کو ملازمت کی مدت پوری
ہونے سے پہلے ہٹا دیا گیا۔ ندا کا قصور اس سلسلے
میں یہ بتایا گیا کہ وہ افیسر سے انگریزی بولتے ہیں
اور افیسر انگریزی جانتا نہیں۔ اسے خجالت محسوس
ہوتی ہے اس لئے ندا کے ساتھ یہ عمل کیا جاتا ہے
ندا جب اپنے رنگ میں ہوتے تھے تو زیادہ تر انگریزی
بولتے نظر آتے تھے اس وقت بھی جب ندا شاعری
کے ابتدائی مراحل سے گذر رہے تھے ادب پر گفتگو
شروع ہوتے ہی انگریزی بولنا شروع کر دیتے تھے
اور پھر شاعروں کے جتنے حوالے ہوتے مغربی ہی
شاعروں کے ہوتے۔ اس طرح میں کہوں گا
ندا نے یہاں کے ماحول کو مغربی ادب کا شعور
بھی دیا۔ لیکن ان کی گفتگو سے جو لوگ استفادہ
کر سکتے تھے وہ کر سکے ہونگے۔

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ان کی شوخی و بیباکی
کے باوجود کسی نے نہ دیکھا ہوگا کہ انہوں نے اپنے شہر
کے بزرگوں مثلاً ریاض انصاری، رضا قریشی، انور
پرتاب گڈھی، سائل حیدری، غنی گوالیاری اور کچھ

دوسرے حضرات کے بارے میں ان کی غیبت
میں بھی سوئے ادب کا مظاہرہ کیا ہو۔ ان
حضرات کی شاعری کو ندا نہایت خاموشی اور
سنجیدگی کے ساتھ سنتے تھے۔ اور اُن کی
زبان وبیان کی قدرت سے محظوظ بھی ہوتے
نظر آتے تھے۔ خود اپنے والد صاحب کے اشعار
بھی کچھ ایسے انہماک سے سنایا کرتے تھے کہ
زبان ومحاورے کی خوبیاں واضح ہوتی چلی جاتی
تھیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ کلاسکی ادب کی خوبیوں
پر ندا کی گہری نظر رہی ہے اور پھر انہوں نے اپنے
لئے علیحدہ راستہ نکالا ہے۔ لوگ یا تو کلاسکیت
کی نقل پر بلکہ بھونڈی نقل پر اتر آئے ہیں یا پھر
اسے یکسر جھٹلا دیتے ہیں یہ دونوں ہی باتیں
ان کی کاوشوں کو مضحکہ خیز بنا دیتی ہیں۔ ندا اس
گمراہی سے بچ نکلے ہیں۔ انہوں نے زبان کے
ورثہ کی حفاظت کی ہے۔

ندا گوالیار کی ہر قسم کی نشستوں اور
ہر سطح کے شاعروں میں شریک ہو جایا کرتے تھے
خواہ وہ ان کے معیار کے ہوں نہ ہوں۔ یہ
بات صرف یہی تھی۔ ادب اور شاعری کیلئے
ندا کو ہر وقت فرصت ہی فرصت تھی اور وہ اس
کے لئے ہر وقت تیار تھے۔ یہ جملہ ان کی زبان سے
بارہا سنا ہوا ہے کہ "شاعری پورا آدمی چاہتی ہے"
لہٰذا انہوں نے اپنے آپ کو ابتدا ہی سے شاعری
کے حوالہ کر دیا ہے وہ جہاں بھی ہیں شاعری کے
لئے ہیں۔ اور شاعری ان کے لئے ہے اُن کی
اپنی پہچان ہے جو ادب کے اوراق پر قائم رہے گی۔

-○-

اکیسویں صدی کی راہ پر گامزن
ایک روایت شکن رسالہ
حسن پرست
چیف ایڈیٹر۔ اجنبی شیلندر
ایڈیٹر۔ مشتاق احمد
زرِ سالانہ ۵۰ روپے
رنگیر پورہ۔ قرول باغ۔ نئی دہلی
5658/79

ندا فاضلی

(ادھا ادھورا تعارف)

ڈاکٹر عزیز اندوری

ندا فاضلی کی پہچان یہ بھی ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے ساتھ ہی اپنی آواز سے بھی پہلی ہی ملاقات میں اپنے مخاطب کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس کی شکل ستارے مشابہ ہے۔ ذرا اس کے قد کو اوپر سے نیچے تک دیکھ لیجئے۔ سر کا حصہ ہو یا دھڑ کی شکل، دونوں ہی کسی ماہر موسیقی کے سجے سجائے ستار کی طرح نظر آتے ہیں۔ اسی لئے اس کے جسم کی ساخت بے ترتیب نہیں۔ چہرے کی طرف نگاہ دوڑائیے۔ آپ کی نگاہ میں کوئی چیز چھپے کی نہیں۔ آنکھیں دیکھیے، شوخیوں کے ڈورے اس طرح تیرتے ہیں جیسے ملا نصیر الدین کی ریش کے باریک باریک بال۔ ابھرے ابھرے گال جیسے آسمان کے بکھرے بکھرے بادلوں کے ٹکڑے، ستواں ناک جیسے ناوک کی نوک، ہونٹوں پر بکھری ہوئی تبسم کی لکیر جیسے وقت صبح طلوع ہوتے آفتاب کی کرنیں دانتوں کا اُجلا پن جیسے کسی سیپ سے نکلے ہوئے تازہ تازہ موتی، سر کے چھدرے چھدرے بال جیسے کسی پگڈنڈی کے ارد گرد گھاس پوس کی نمو، ہاتھوں کی انگلیوں میں دبی سگریٹ جیسے چولہے میں سلگتی پتلی پتلی تیلیاں۔ کہیں کہیں سے "ابھرا ہوا پیٹ" جیسے کہ چٹیل میدان، گفتگو کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے جیسے ستار پر کوئی مخروطی انگلی اچانک پڑ گئی ہے

یہ تو ہیں ندا کی شخصیت کے نقوش، جن کی وضاحت اس لئے کی گئی کہ اگر کہیں ندا کا کوئی "ڈپلیکیٹ" بھولے بھٹکے اصل ندا ہونے کا دعویٰ کر دے تو ہمارے پیش کردہ خاکہ کی روشنی میں اصل اور نقل کو ہمارے قارئین واقف ہو سکیں اور نقلی اور بناوٹی ندا کے دعوے کو فوراً جھٹلا دیں اور اس فریبی کو ادب کے کٹہرے میں کھڑا کر کے سخت سے سخت سزا دلوائیں۔

ویسے ندا کو اس کی عادتوں اس کے طور طریقوں سے بھی پہچانا جا سکتا ہے۔ گردن

گھما گھما کر، یا انگلیوں کو نچا نچا کر جو شاعر مشاعرے میں
اپنی کوئی نظم، غزل، گیت یا دوہے سنا رہا ہو یا اکثر
ٹیلی ویژن کے مشاعروں میں کسی شاعر کے تعارف
سے قبل اپنے والد دعا گو بائیوی کے استاد نوح
ناروی کے خالص زبان کے اشعار سنا کر سامعین
کی داد سے قبل سامعین سے تالیاں بجانے کا
اصرار کرتا ہو۔ اسے پہچاننے میں ذرا دیر نہیں لگتی
وہ ندا فاضلی کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ ایسے میں
اگر ٹیلی ویژن پر اس کے نام کا کیپشن نہ دیا جائے
تب بھی ناظرین اسے پہچان لیتے ہیں۔

طبیعت کے اعتبار سے یہ شخص کئی متضاد
صورتوں میں پہچانا جا سکتا ہے اس کی طبیعت میں
جذبۂ عشق ترو تازہ رہتا ہے۔ بالکل گلاب کی پنکھڑیوں
کی طرح۔ گویا اس سلسلہ میں اس کی طبیعت کئی
خانوں میں تقسیم نظر آتی ہے۔ وہ حسب موقع اپنی
طبیعت کے کسی خانے کو وا کرتا ہے وہاں سے
استطاعت اور ماحول کے مطابق اپنے جذبۂ عشق کو
باہر لاتا ہے۔ اور فضاؤں میں بکھیر دیتا ہے اس کا
یہ عمل بازی گروں کی طرح نہیں ہوتا۔ کہ وہ نظر بندی
کر کے مقابل کو دام عشق میں گرفتار کرے۔ یہ الگ
بات ہے کہ گرفتار ہونے والا اس جذبے کی تازگی
کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ اس لئے کہ ندا میدان عشق
میں جادوئی تماشے دکھانے کا خود قائل نہیں ہے
لوگ اسے چاہے جس نظر سے دیکھیں۔ مگر اس نے
اپنی ایک نظم میں بمبئی اور کراچی کے درمیان بیٹے اور
ماں کے عشق کو جس طرح پیش کیا ہے یا ہاجرہ کے
آنسوؤں میں ایک ماں کی اولاد کے لئے جو تڑپ
دیکھی ہے۔ اس سے تو ندا کے عشق کی طہارت پر ایمان
لے آنے کو جی چاہتا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے ذاتی عشق
کے سلسلے میں کسی ایک مرکز پر نہیں ٹھہر سکا ہے۔ شاید
اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے پیروں میں یہ مراکز
کوئی مضبوط زنجیر نہیں ڈال سکے ہیں یا پھر وہ ع
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ کے تحت اس جذبہ کو
زندگی کی آزمائش سمجھ رہا ہے۔

اخلاقی پاسداریوں کا بھی وہ قائل رہا ہے
حالانکہ وہ شہر یا جس ماحول میں ان دنوں سانس
لے رہا ہے وہاں اس قسم کے عمل کی گنجائش بہت
نکلتی ہیں۔ مگر وہ صورتوں میں غیر تاجرانہ سلوک کا
اظہار کر ہی دیتا ہے۔ کم از کم میرے ساتھ تو

اس نے کئی بار رعایتوں سے کام لیا ہے

ندا بڑا بیباک قلم کار ہے اس نے لفظوں کے پل پر بھی سفر کیا ہے۔ اور اس پر سے وہ بغیر ڈگمگائے آسانی کے ساتھ گزر گیا ہے۔ بمبئی پہنچ کر اس نے وہاں کے کئی چمکدار ادبی شخصیتوں سے بڑی بے باکانہ ملاقاتیں بھی کیں۔ اور دوران ملاقات بہت سی شخصیتوں کی چمک کو پھیکا بھی کر دیا۔ اس کا جرأت مندانہ قدم اس کے احساس برتری کا ثبوت بھی بنا۔ اس کی یہ ملاقاتیں یوں ہی سی نہیں تھیں۔ اس نے اس کے ذریعہ کچھ نتائج بھی نکالے۔ اور بہت سی غیر اہم ادبی روایات کو توڑنے کی جرأت بھی کی۔ ڈر تھا کہ وہ اپنے اس کئے کی سزا نہ پائے۔ اور اسے بمبئی جیسے شہر میں کوئی بہت بڑا خمیازہ نہ بھگتنا پڑے۔ مگر اس نے ان سارے اندیشوں کو رد کر دیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ وہ ابھی تک اس شہر میں نہ صرف تازہ دم ہے۔ بلکہ اپنی سانسوں کو مزید تازہ بناتا جا رہا ہے۔

ادب سے فلم کی طرف وہ آیا۔ اسے بمبئی لانے میں اس کے برادر خورد صبا فاضلی کی حوصلہ افزائی نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ صبا فلم میں پہلے سے موجود تھے مگر اُن کے چلے جانے کے بعد ندا نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز کیا۔ اسے ابتدا میں جو اٹھان ملی اس نے اس کا زیادہ ساتھ نہیں دیا یہ بدنصیبی ندا کی نہیں بلکہ یہ عمل اور سلوک بمبئی کی قلم نگری کی روایت کا ایک حصہ تھا۔ کہ جس نے ندا کو گیت کار کے لحاظ سے بہت آگے نہیں جانے دیا۔ مگر اس نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ اور اسی نوع کے دوسرے پہلو یعنی ٹی وی Episode لکھنے کی طرف مائل ہو گیا اور اس میں اس نے فلم سے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ ادب کے علاوہ چوں کہ اس کا تعلق فلم سے ابھی تک ہے۔ اس لئے وہ اب بھی املی کی اس کھاس میں آم کا رس گھول ہی دیتا ہے۔

ان ساری صورتوں کے باوجود وہ میری نظر میں گوالیار کی اس سرزمین سے ابھرا ایک سچا فن کار ہے۔ جس نے تان سین۔ سے لیکر جان نثار اور دعاؔ ڈبائیوی جیسے متعدد فن کار پیدا کیے۔ اس کی فن کارانہ خوبیوں کو ابھارنے میں اس کی شخصی اور ذاتی کاوشوں کو بڑا دخل ہے۔ اس نے اپنے ادبی شعر کا آغاز کامریڈ موتی لال اکامریڈ رام لال اور پرکاش کے ہوٹل میں بیٹھ کر ادبی و شعری مباحثوں سے

کیا تھا۔ اور گوالیار میں اسے عروج ملا تب بھائی سلام مچھلی شہری، ساغر نظامی وغیرہم کی آمد سے اس نے PWA کی روشن نشستوں سے اپنے ذہن کو چمکایا۔ اس نے شبلی کی سیرۃ النبی سے لیکر کارل مارکس، ٹالسٹائی، ہکسلی، میرا بائی، کبیر، سور، خسرو غالب، اقبال، فیض، جوش سب کو ایک سانس میں پڑھ ڈالا تھا۔ اور حیرت ہے کہ اس متضاد مطالعہ کے باوجود اس کی سانس نہ تو بے ترتیب ہوئی اور نہ اکھڑی۔ بلکہ اس نے تازہ دم ہو کر اپنی ذہنی بالیدگی کو چمکایا۔ بلند کیا۔

ادب کا یہ سرمایہ لے کر جب وہ بمبئی پہنچا۔ تو اول اول اسے فلم و لم سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی وہ اپنا وقت زیادہ تر بمبئی کے ادبی حلقوں میں گزارتا رہا۔ وہاں کے بڑے بڑے ادبی ستونوں کے حجم کو ناپتا رہا۔ ملاقاتیں کرتا رہا۔ کھٹی میٹھی ملاقاتیں، اسی بہانے وہ بہت سے بہروپیوں کی نقابیں الٹتا رہا اس ماحول میں وہ بیک وقت ترقی پسندی کا حامی بھی رہا اور مخالف بھی۔ اس نے اس حصار کو توڑنا چاہا جس میں محصور ہو کر ۱۹۳۶ء میں ابھرنے والا ترقی پسند نظریہ — دم توڑ رہا تھا۔ جھونپڑی کے باسیوں، مل کے مزدوروں، کھیت کے کسانوں کے مسائل کو حل کرنے کی قسم کھانے والا قلم جب تعیش پسندی، مفاد پرستی، خود غرضی، اور اپنی ضمیر کی آواز کے خلاف "کالا دھن" بٹورنے میں مصروف نظر آیا تو ندا نے ایک زبردست دھماکا کیا "ملاقاتیں" چھپوا کر — جو اس "فقرِ ادب" کو ڈھانے کے لئے تیشۂ فکر ثابت ہوا۔ جس میں رقصِ سرود کی محافل جمی تھیں — مگر اس کے روبرو بھی غالب کی طرح یہ سوال بھی ابھرا کہ ع

پیٹ بڑا پاپی ہے غالب جیسے شاعر سے قصیدے لکھوا سکتا ہے تو بیچارہ ندا ...... اسے بھی بہت سے بہادر شاہ ظفر نما شخصیتوں سے یقیناً واسطہ پڑا ہوگا فلم پروڈیوسروں کی شکل میں — اور اس نے غالب ہی کی طرح فلمی گانے (فلم کی سچویشن کے مطابق) دوسروں کی مرضی کے مطابق بھی لکھے ہوں گے مگر جس طرح غالب کا جی قصیدے مدح کہنے میں نہیں لگتا تھا اور وہ کامیاب ترین تشبیب لکھنے کے باوجود ذوق کے مقابلے میں بہتر قصیدہ گو بن نہیں سکا۔ اسی طرح ندا بھی اپنے گاؤں کے بوٹو نیں جان ڈالتا رہا۔ مگر ذوق کی طرح بمبئی میں بھی اُسے

کئی مقبول فلمی شاعروں سے مقابلہ کرنا پڑا اور جس طرح غالب نے قصیدے کے میدان سے اپنے قدم کھینچ لئے تھے۔ اسی طرح ندا بھی...... اور پھر اس نے خود کو شعر و ادب کے لئے تخلیقی عمل سے پوری طرح جوڑ لیا۔

امرا پارٹمینٹ کے بالائی حصہ کے ایک فلیٹ کے دروازے پر لگی گھنٹی کو جب آپ بجائیں اور جو شخص دروازہ کھولے۔ اسے میرے خاکے کے ابتدائی حصہ کی روشنی میں پہچان لیجئے جی ہاں وہی ہوگا ندا فاضلی۔ جو آپ کو اپنے فلیٹ کے پہلے سجے سجائے کمرے میں جائے گا وہاں بٹھائیگا آپ سے گفتگو کا آغاز کریگا۔ اگر آپ اس کی نگاہ میں بور نکلے تو وہ اپنے مصرعہ کی روشنی میں آپ سے ہاں ہوں کرتا رہے گا۔

ع دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

اور اگر آپ کی باتیں دلچسپ ہوئیں تو چائے یا پانی سے لیکر پھل پھول وغیرہ تک سے آپ کی خاطر کرے گا۔ اور آپ بھول جائیں گے۔ کہ بمبئی میں صرف "تجارتی ملاقاتیں" ہی ہوتی ہیں۔ آپ کو ماننا پڑے گا کہ وہاں اخلاقی ملاقاتیں کرنے والے بھی موجود ہیں۔

ندا کار حیات کو سر کرنے کے لئے اب ماشاء اللہ اپنی کار میں بھی نکلتا ہے۔ (یہ بات مجھے چند معتبر دوستوں نے بتائی ہے) اور یہ اس لئے کہ بمبئی جیسا شہر بے کار انسانوں کو تیز رفتار نہیں بننے دیتا یہ بھی سنا ہے کہ وہ ابھی امریکہ یا دوسرے یورپی ممالک کے کار مالکوں کی اس صنف میں تو شامل نہیں ہوا ہے جہاں کار چلانے والا ملازم اپنے مالک کی بلڈنگ یا کوٹھی تک اپنی کار میں جاتا ہے اور اپنی کار کو مالک کی بلڈنگ یا کوٹھی میں رکھ کر مالک کو اس کار میں سیر سپاٹے کے لئے لے جاتا ہے۔

بہر حال ندا کی کار کبھی اس کے ذریعہ اور کبھی کسی ڈرائیور کے ذریعہ چل رہی ہے۔ مگر اس کار کا مصرف وہ بہت سی سابقہ ریاستوں کے نوابوں کی اجڑی ہوئی جاگیر کے بگڑی ہوئی اولادوں کی طرح دودھ یا سبزی لانے کے لئے نہیں کرتا۔ بلکہ سوچ سمجھ کر اسے اپنے گیرج سے باہر لاتا ہے اسی کر اس کی کار باقاعدہ پٹرول سے چلتی ہے۔ کسی ڈھونگی فقیر یا نقلی رشی کے دم کیے ہوئے پانی نہیں آپ کسی بھی ملک کسی بھی شہر کسی بھی قصبہ یا کسی

بقیہ صفحہ ۱۳۳ پر

صابر دت کا تاریخ ساز کارنامہ

فن شخصیت اور ممبئی

اُڑتے ہوئے لمحات زنجیر کیا ہے
تاریخ کو تصویر میں تحریر کیا ہے
صابر دت

چند تصویرِ بتاں — جس میں ۱۲۵۳ سے ۱۹۳۰ء تک کے
مشاہیر زبان و ادب کی تصاویر مع تحریر شائع کی گئی ہیں
اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا ادبی البم — آفسیٹ طباعت، آرٹ پیپر، بڑا سائز
قیمت پانچ سو روپے، بیرون ہند پچھتر (۷۵) امریکی ڈالر
ملنے کا پتہ:- ساحر پبلشنگ ہاؤس، پرچھائیاں - اے، بی روڈ، جوہو چرچ ممبئی ۴۰۰۰۴۹

بقیہ - (محسن لطیف)

غزلوں، اور نثری نظموں میں وہ زندگی کو اس کے
تہذیبی و اقتصادی تضاد کے ساتھ قبول کرتے ہیں
لیکن اس قبولیت میں ان کے مزاحی احتجاج کی لو
کہیں مدھم نہیں ہوتی

تیرا سچ ہے ترے عذابوں میں
جھوٹ لکھا ہے سب کتابوں میں

اپنے سچ کی اسی تلاش نے ندا فاضلی کی شاعری کو
وہ تجرباتی و مشاہداتی تیور عطا کیے ہیں جو جگ بیتی کو
آپ بیتی کا تاثر عطا کرتا ہے۔ اس میں شعریت بھی ہے
اور فکری بلوغت بھی۔ — مخلص

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

ندا بھائی

از: ابوالفہیم اشک

۳۰۴، سائیں نواس۔ شانتی نگر کرلا ڈپو۔ بمبئی

منجھلا قد، گندمی رنگ، چوڑی پیشانی۔ جو سر کے بال اڑ جانے سے اور بھی زیادہ چوڑی ہوگئی ہے۔ لمبی ناک، آنکھوں میں شرارت، باتوں میں ذہانت کم، مسخرہ پن زیادہ، ادائیں تو یہ ادائیں مشاعرہ پڑھتے وقت اور بھی زیادہ قابلِ دید ہو جاتی ہیں، عادتاً غیر سنجیدہ، فطرتاً دوسروں کو کمتر سمجھنا اور اُن کا مذاق اڑانا۔ ایسی شخصیت اگر آپ کو بمبئی کے علمی اور فلمی حلقوں۔ ٹی وی کے یا عام مشاعروں میں نظر آجائے تو جان لیجئے کہ اس کا نام ندا فاضلی ہے اور لوگ سے ندا بھائی کہتے ہیں جہاں تک میرا سوال ہے میں انہیں ندا صاحب کہتا ہوں۔

۱۹۷۰ء کے بعد جن جدید شعراء حضرات کے نام اردو ادب میں اُبھرے اُن میں ندا بھائی کا نام بھی لیا جاتا رہا ہے۔ میں اُن دنوں مدھیہ پردیش کے شہر اندور سے ہندی میں شائع ہونے والے ڈیلی اخبار "اندور سماچار" میں تین کالم لکھا کرتا تھا۔ ایک بچوں پر۔ دوسرا حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرنے والی نظم پر۔ اور تیسرا کالم تھا اردو ادب کو دیوناگری میں اردو ساہتیہ کے تحت پیش کرنا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں اندور کے رویندر بھون میں ایک مشاعرہ ہوا تھا اور ندا بھائی نے اس مشاعرہ میں کامیابی کے ساتھ اشعار پڑھے تھے۔ اس مشاعرہ کے بعد ہی سے ندا بھائی مجھے بحیثیت شاعر یاد رہ گئے تھے ۱۹۷۲ء کے زمانہ میں "شمع" کی ملازمت کے سلسلے میں میرا دہلی جانا ہوا اور وہاں آٹھ برس تک ادبی حلقوں میں سرگرم عمل رہا۔ ندا بھائی کی غزلیں اور نظمیں میری نظر سے گزرتی رہیں۔ اور ایک اچھے شاعر کے طور پر اُن کی ملاقات مجھ سے ہوتی رہی اسی زمانہ میں مرحوم جان نثار صاحب دو تین بار دہلی آئے میری اُن سے شہاب جعفری صاحب کے ہاں ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن ایک چھوٹی سی نشست بھی ہوئی

میں نے قمر رئیس، شہاب جعفری، اور جاں نثار صاحب نے اپنا کلام سنایا

میری غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے جاں نثار صاحب نے ہدایت کرتے ہوئے بچپن کا ایک واقعہ سنایا۔ ہوا یوں کہ ایک بار وہ کسی کام کے سلسلے میں آگرہ گئے وہاں فانی بدایونی صاحب سے ملے اور انہیں اپنا تازہ کلام سنایا فانی صاحب نے جاں نثار صاحب کو ہدایت دی اور کہا "میاں تم اچھے شعر کہتے ہو لیکن تمہارا رنگ اپنے والد مضطر خیرآبادی سے قطعی مختلف ہے۔ اگر بڑا شاعر بننا ہے تو اُن سے اصلاح نہ لینا جاں نثار صاحب نے فانی بدایونی کی اس ہدایت پر عمل بھی کیا۔ انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "آج میں بھی تمہیں ہدایت دے رہا ہوں کہ تم اچھے شعر کہتے ہو شہاب جعفری سے تمہارا رنگ مختلف ہے کبھی ان سے اصلاح نہ لینا" میں جاں نثار صاحب کی اس ہدایت پر آج تک عمل پیرا ہوں

اس نشست میں ندا فاضلی کا ذکر بھی آیا جس پر جاں نثار صاحب نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ سبب یہ تھا کہ جاں نثار صاحب نے ندا بھائی کے لئے فلموں میں جگہ بنائی اور ان کے پیر جمانے کے لئے کافی کوشش کی تھی اور ندا بھائی نے انہیں کی پیٹھ پر قدم رکھ کر آگے بڑھنے کا چلن اپنایا جو جاں نثار صاحب کو ناگوار گزر رہا تھا۔

سنہ ۱۹۷۰ء کا زمانہ جب میں ادارۂ شمع دہلی ہی میں ملازمت کر رہا تھا۔ ایک دن وہاں عزیز اندوری صاحب (جو میرے ساتھ ہی کام کرتے تھے) مجھے ایک شخص سے ملایا جو بدحالی کا شکار تھا اور بمبئی کی فلمی دنیا میں جدوجہد کرنے کے بعد ناکام لوٹ آیا تھا۔ یہ شخص ظہیر کیفی امروہوی تھے ملاقات کے دوران انہوں نے بتایا کہ بمبئی میں ندا بھائی سے ان کی اچھی دوستی رہی ہے۔ اور یہ کہ ندا بھائی انکی بات بھی مانتے ہیں۔ ان دنوں ندا بھائی کا نام فلموں سے جڑنے لگا تھا اور ایک ناکام فلم کے مکالمے بھی وہ لکھ چکے تھے۔ فلم کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا ہے۔

ظہیر کیفی امروہوی نے مجھے بار بار کہا ابراہیم صاحب آپ بمبئی جائیے آپ کی صلاحیتوں کی قدر اس شہر میں ضرور ہوگی۔ میں نے کہا میرے لئے وہاں رہائش کا مسئلہ درپیش ہوگا ظہیر کیفی بولے ــــ وہ تو میں حل کئے دیتا ہوں۔ میں نے حیرت سے پوچھا

کیسے ؟ کہنے لگے اشک صاحب وہاں اپنا یار ندا ہے
آپ فکر نہ کریں میں کل ہی اسے خط لکھتا ہوں
آپ کا بند و بست مجھو ہو گیا۔ ظہیر کیفی نے دوسرے ہی
دن میرے ساتھ بیٹھ کر ندا بھائی کو خط لکھا اور پوسٹ
کر دیا۔ ان کے ساتھ میں بھی خوش تھا کیونکہ بمبئی
آ کر کچھ کر گزرنے کی آرزو اب بےچین کرنے لگی تھی۔
ندا بھائی نے ظہیر کیفی کے اس خط کا کوئی
جواب نہیں دیا اور اس کے نتیجے میں ظہیر کیفی جیسا
حساس افسانہ نگار احساس پشیمانی کے بوجھ سے
میرے آگے گردن نیچی کرنے لگے تو میں نے انہیں سمجھایا
کہ اس دنیا میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا ہے کیونکہ
سب اپنی ہی روٹیاں سینکنے میں سرگرم عمل ہیں
مجھے یاد ہے ظہیر کیفی نے دوسرا خط لکھ کر ندا بھائی
سے اپنی دوستی ختم کر لی تھی۔

۱۹۸۰ء میں جس وقت میں نے بمبئی میں
قدم رکھا غزل سنگروں کی محفلیں اپنے عروج پر تھیں
مترنم غزلیں لکھنے والوں میں قیصر الجعفری، ندا بھائی
سعید راہی، احمد وصی کے نام قابل ذکر ہیں ایک
شاعر اور بھی تھے ممتاز راشد جنہوں نے پنکج ادھاس
کی مصاحبت کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا صبح
گیارہ بجے سے دیر رات گئے تک وہ پنکج کو گھیرے
رہتے تھے۔ اور ان کے پرائیویٹ سکریٹری کا کام
کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے ندا بھائی ان کی
خوب لیتے تھے۔ اور انہیں خواہ مخواہ اس غلط فہمی
کا شکار کرتے کہ وہ غالب اور میر سے بھی بڑے شاعر ہیں
بیچارے ممتاز راشد اس غلط فہمی کا شکار ہو کر آج
کہیں کے نہیں رہے۔ غزل سنگروں کے زوال
کے ساتھ ہی ان کا زوال بھی اپنے عروج کو جا پہنچا
میری غزلوں کے ریکارڈ جب بڑی تعداد میں
بننے لگے۔ محفلوں میں میری غزلیں کامیابی سے گائی
جانے لگیں۔ میرا نام غزلوں کی محفلوں اور ریڈیو T.V
پر نشر ہونیوالی غزلوں میں سب سے زیادہ سنا
جانے لگا۔ تو ممتاز راشد کو راتوں کی نیندیں
زیادہ حرام ہونے لگیں۔ اور انہوں نے میرے
خلاف باقاعدہ ترقی پسند تحریک کی طرح ابراہیم اشک
ہٹاؤ تحریک کا بیڑا اٹھایا اور میری مخالفت میں سرگرم
عمل ہو گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے اخلاق
رکھ رکھاؤ اور میری فنی صلاحیتوں کے آگے انجام
کار وہ ذلیل و رسوا ہوئے۔ اور کئی غزل سنگروں
کے یہاں سے بڑے بے آبرو ہو کر نکلے۔ اور آخر میں

تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ ممتاز راشد بڑے ندا بھائی نے ایسا کونسا جادو کر رکھا ہے کہ وہ اُن کی گالیاں کھا کر بھی بے مزہ نہیں ہوتا اتنا ہی نہیں وہ ندا بھائی کی غزلیں بھی غزل سنگروں کو گانے کے لئے دیتا ہے اور ندا بھائی کو ان سے ملواتا بھی ہے۔

انہیں دنوں دہلی سے ایک نئے غزل سنگر چندن داس کی بمبئی آمد ہوئی۔ میں چندن کو دہلی سے جانتا تھا۔ وہ نظام الدین میں رہتے تھے اور ادھر پرائے ہوٹل میں غزل گایا کرتے تھے وہاں وہ میری بھی کچھ غزلیں کامیابی سے گاتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں دہلی میں اکثر ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی ہم کبھی کبھی غالب اکیڈمی میں جا بیٹھتے تھے۔ میں بمبئی ان سے پہلے آچکا تھا اور جب انہوں نے بمبئی آنے کا ارادہ کیا تو میں نے ان کی بڑی حوصلہ افزائی کی

بمبئی آنے پر چندن داس تقریباً روز ہی مجھ سے ملتے اور اپنی دن بھر کی روداد بیان کرتے۔ ایک دن ہوٹل شیمبوشہ پر اُن کی ملاقات ممتاز راشد سے ہوئی۔ اور ممتاز راشد نے دوسرے ہی دن چندن کو ندا بھائی سے ملوانے کا وعدہ کر لیا

چندن نے جب مجھے آکر بتایا اور پوچھا کہ ابراہیم بھائی یہ لوگ کیسے ہیں۔ اور ان سے رسم و راہ بڑھانا چاہیے یا نہیں۔ تو میں نے چندن کو سمجھایا اور کہا —— "ممتاز راشد اور ندا فاضلی بھی ستھری غزلیں کہنے کا ہنر جانتے ہیں تمہیں ان سے مل کر فائدہ ہی ہوگا اور کچھ اچھی غزلیں مل جائیں گی"۔

دوسرے دن چندن داس کو راشد ندا بھائی کے یہاں لے گیا۔ اور چندن کی ملاقات ندا بھائی سے کرا دی۔ وہاں سے پلٹ کر چندن داس میرے پاس آیا تو کہنے لگا۔ "ابراہیم بھائی یہ لوگ آخر کیا سمجھتے ہیں مجھے؟ کیا میں بمبئی اس لئے آیا ہوں؟" میں نے تسلی دیکر پوچھا "آخر ماجرا کیا ہے؟" اور جب وہ بتانے لگا تو میرے سامنے ندا بھائی کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آگیا۔ چندن نے کہا "یہ لوگ تو بہت ہی گھٹیا قسم کے ہیں۔ مجھے مشورہ دیتے ہیں کہ ہم تمہیں طوائفوں کے کوٹھے پر گانا سکھانے کیلئے لگا دیتے ہیں۔ جیب خرچ بھی نکل جائے گا اور عیش بھی کرنے کو ملے گا۔ ویسے کبھی پاس پیسہ نہ ہو ہم بھی تمہاری مدد کر دیا کریں گے۔ ابراہیم بھائی میں اس مقصد سے بمبئی نہیں آیا ہوں۔ میں نے

سنجیدگی سے چندن داس کو سمجھایا کہ اس کے باوجود تم ان شاعروں سے ملتے جلتے رہا کرو۔ بعد میں ندا بھائی نے چندن داس کو ادا شگفتہ اور امجد خاں سے بلوایا۔ اس کے L.P. ریکارڈ میں امجد خاں کی کمنٹری بھی شامل کروائی۔ اور پتہ نہیں کیا کیا سنہرے خواب دکھائے کہ چندن ندا بھائی کے گن گانے لگا اور ان کی کئی غزلیں بھی اس نے ریکارڈ کیں اب عالم یہ ہے کہ چندن کو مجھ سے ملے برسوں گزر جاتے ہیں لیکن ندا بھائی سے وہ اسی طرح ملتا جلتا رہتا ہے جیسے کبھی ابراہیم اشک سے ملتا جلتا تھا۔

ابتدا میں جب میں بمبئی آیا تھا تو دل میں ندا بھائی سے کبھی کبھار ملنے کی آرزو کروٹ لیتی تھی۔ اور جب ایک دن فیاض رفعت کے ساتھ میں مکتبہ جامعہ گیا تو وہاں ندا بھائی سے بھی ملاقات ہوگئی۔ بڑی دیر تک فیاض رفعت اور ندا بھائی میں بے تکلف نوک جھونک سے بڑھ کر مہذب باتیں ہوتی رہیں اور فیاض رفعت نے اپنی گالیوں سے ندا بھائی جیسے بولتو خاں کو خاموش کردیا ندا بھائی سے بمبئی آنے کے بعد یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ جب ندا بھائی کو تعارف کے دوران میں نے بتایا کہ میں بڑنگر ضلع اجین مدھیہ پردیش کا رہنے والا ہوں۔ تو طنزیہ بولے "مدھیہ پردیش والے ہو تو اردو ادب میں شعر کیسے کہہ لیتے ہو" میں نے پلٹ کر جواب دیا "اسی طرح کہہ لیتا ہوں جیسے آپ کہہ لیتے ہیں۔ (یاد رہے ندا بھائی بھی گوالیار مدھیہ پردیش کے ہیں) میرے اس برجستہ جواب نے شاید انہیں ہوشیار کردیا تھا۔ کہ اس شخص سے سنبھل کر بات کرنا چاہیے۔ اگر اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تو مہنگا پڑے گا۔ اس روز پہلی بار ندا بھائی نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔

دوسری دعوت اس کے مہینوں بعد جب ندا بھائی مجھے ہوٹل جیوتی میں ملے تب دی تھی اس وقت میرے ساتھ غزل سنگر گھنشیام واسوانی بھی تھے ندا بھائی نے بڑے اصرار اور محبت سے کہا "کبھی گھر پر تشریف لائیے۔ عرصہ دراز کے بعد ریکارڈنگ اسٹوڈیو ریڈیو میں ملے۔ جہاں راج کمار رضوی میری اور ان کی غزلیں ریکارڈ کر رہے تھے وہاں بھی انہوں نے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ اس طرح تین بار وہ مجھے مجبور کر چکے تھے۔ اور میں ان کے یہاں جانے کے بارے سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا۔

یہ حسن اتفاق تھا کہ ایک دن میں پالی ہل سے

سے مشہور سنگر بھوپیندر سنگھ کے گھر سے واپس
لوٹ رہا تھا کہ ہندی اخباروں میں صحافت کرنے
والے امین خاں مل گئے۔ جو ندا بھائی کے یہاں
کسی کام سے جا رہے تھے۔ انہوں نے اصرار کیا
کہ میں بھی اُن کے ساتھ ندا بھائی کے یہاں چلا جاؤں
موقع اچھا تھا ندا بھائی تین بار مجھے اپنے گھر آنے
کے لئے کہہ چکے تھے۔ میں امین خاں کے ساتھ ندا بھائی
کے یہاں چلا گیا۔ لیکن میری حیرت کا اُس وقت ٹھکانہ
نہیں رہا جب یہ دیکھا کہ ندا بھائی نے پہچانا تک
نہیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک میں یہی دیکھتا رہا
کہ شاید اب وہ مجھے پہچان لیں گے لیکن جلد ہی مجھے
احساس ہو گیا کہ "فلمی اسٹائل" میں وہ مجھے نظر انداز
کر رہے ہیں میرے لئے وہاں بیٹھنا دوبھر ہو رہا تھا
اور میری برداشت کی انتہا ہو چکی تھی۔ آخر جب
اٹھنے لگے تو میں پھٹ پڑا اور میں نے ندا بھائی سے
کہا ۔۔ گھر بلا کر لوگوں کی خاطر آپ خوب کرتے ہیں
تین بار آپ نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی
اور آج جب حاضر ہوا تو پہچان تک نہیں رہے ہیں"
امین خاں میرا منہ تکنے لگے۔ اور ندا بھائی یہ سوچ کر
کہ ان سے غلطی ہو گئی معافی مانگنے لگے۔

پھر یہ ہوا کہ میں بھول گیا۔ ندا بھائی کون ہیں اپنی غزلوں
کی بے پناہ ریکارڈنگ کے دوران دو چار جگہ وہ
ریکارڈنگ اسٹوڈیو میں ٹکرائے بھی۔ لیکن میں نے
ندا بھائی کو پہچاننے انکار کر دیا کچھ لوگوں کو حیرت ہوئی
اور ندا بھائی کو بھی اس بات کا احساس ضرور ہو گیا
ہوگا۔ اور وہ جان گئے ہونگے کہ یہ شاعر بمبئی کے اُن
شاعروں جیسا نہیں ہے جن کو نظر انداز کرنے کے بعد
بھی وہ ندا بھائی کے آس پاس منڈلاتے ہیں
اپنی شان سمجھتے ہیں

سال دو سال بیت گئے۔ ریکارڈ غزل
کی محفلوں، ریڈیو اور T.V. پر نشر ہونے والے
پروگراموں میں ہر طرف ابراہیم اشک کا نام گونجتا رہا
پھر ایک دن کھار اسٹیشن پر ندا بھائی سامنے سے
آتے نظر آئے۔ آنکھیں ملیں تو مسکرا دیے۔ میں نے
پوچھا۔ "آپ نے مجھے پہچانا۔ اپنی مخصوص مسکراہٹ
کے ساتھ پان چباتے ہوئے بولے "ہاں پہچان لیا"
میں پھر سوال کیا "کون ہوں میں" پھر اسی انداز
میں بولے "ابراہیم اشک" اور سچ پوچھیے اُس وقت
میرے دل کو بڑا سکون ملا۔ سچ پوچھیے تو ندا بھائی
سے اپنی یہ پہچان کرانے کے لئے میں نے دو تین

برس کری محنت کی تھی۔ اس بار پھر انہوں نے مجھے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ میں گیا الہام کا مسودہ میرے پاس تھا۔ جس پر ندا بھائی سے رائے لکھوانا تھا

اس بار ندا بھائی بڑے تپاک سے ملے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ چائے کے دو ایک دور چل گئے۔ کئی لوگوں کو انہوں نے فون کئے پان چباتے رہے گنگناتے رہے جیسے کوئی گیت یا غزل ان پر نازل ہونے والی ہو اسی درمیان میں صابر دت آگئے ندا بھائی نے ان کی پھرکی لینا شروع کر دیا اور مجھے کوفت ہونے لگی۔ اچھا ہوا صابر دت کو کہیں جانا تھا وہ چلے گئے۔ ندا بھائی نے اپنی گاڑی نکالی اور کار ٹر روڈ پر مجھے پان کھلانے کے لئے لے چلے حالانکہ مجھے پان چبانے کی عادت نہیں ہے لیکن ندا بھائی کے اصرار پر اس روز میں نے سادہ پان کھایا

اس درمیان دو چار بار میرا ان کے یہاں جانا ہوا تب کہیں جا کر انہوں نے الہام پر اپنی مصلحت آمیز رائے لکھ کر دیدی۔ شاید انہوں نے "الہام" کا مسودہ پڑھا بھی نہیں۔ فن کار کے ساتھ یہ نا انصافی وہ بھی ایک فن کار کے ذریعہ مجھے ناگوار گزرا۔ پھر بھی ان کی رائے کا کچھ میں نے اپنی کتاب شامل کر لیا۔ اس طرح ندا بھائی کا یہ ایک روپ میرے سامنے اجاگر ہوا۔

پھر جب "تکمیل" بمبئی کے ایک شمارہ میں فیض احمد فیض پر میرا دو ٹوک اور بے لاگ مضمون شائع ہوا تو کئی ترقی پسند اور فیض کے چاہنے والے ناراض ہو گئے ندا بھائی اُن میں سر فہرست تھے۔ مجھ پر تنقید کرنے کا انہیں ایک اچھا موقع ہاتھ لگا تھا۔ ایک دن تکمیل کے ایڈیٹر منظر سلیم نے بتایا "کچھ تمہارے مضمون کے تعلق سے ندا بھائی کافی کچھ کہہ رہے تھے عزیز قیسی صاحب سے بڑی دیر تک اس سلسلے میں بحث کرتے رہے۔ اور تمہیں برا بھلا کہتے رہے منظر سلیم نے یہ بھی بتایا۔ کہ عزیز قیسی صاحب نے تیرے مضمون کو ایک جرأت مندانہ اقدام بتایا اور کہا ہر ایک کو اپنی رائے کے اظہار کا حق حاصل ہے بلکہ کچھ اور حوالے ابراہیم اشک دے سکتے تھے اور مضمون کو آگے بڑھا سکتے تھے"

ایک اور ملاقات میں منظر سلیم نے بتایا کہ جب میرے مجموعہ کلام "الہام" کا "تکمیل" میں پورے صفحے پر اعلان شائع ہوا تو ندا فاضلی کو بہت ناگوار

گزرا اور انہوں نے میرے تعلق سے بہت کچھ الٹی سیدھی باتیں کہیں ندا بھائی نے مظہر سلیم کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ کیوں ہر کسی کو شائع کر دیتے ہیں۔ ندا بھائی کے اس رویہ سے صاف طور پر حسد کی بو آرہی تھی۔ اور پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ یہ شخص جو ظاہری طور سے آوارہ گرد نظر آتا ہے اس کا باطن کچھ اور ہے۔ اس پر یہ خوف مسلط ہے کہ دوسرا کوئی اس سے بازی نہ لے جائے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ندا بھائی جو ریڈیو اور T.V. کے مشاعروں کی فہرست ترتیب دیتے ہیں۔ گذشتہ آٹھ برسوں میں انہوں نے اس میں میرا نام شامل نہیں کیا

مجبور ہو کر مجھے اس بات سے T.V. کے افسروں کو آگاہ کرنا پڑا۔ اس کے باوجود بھی ندا نہیں چوکے اور ستمبر ۱۹۹۱ء کے T.V. مشاعرہ کی فہرست سے ایک بار نہیں تین بار میرا نام کاٹنے کی ناکام کوشش کی جس پر دوردرشن کے افسروں کو حیرت ہوئی اور ندا بھائی کے حسد سے بھی وہ واقف ہو گئے۔ یہ مشاعرہ جن لوگوں نے بھی دیکھا اور سنا ہے انہوں نے میرے کلام کو سراہا اور پسند کیا۔ اتنا ہی نہیں کیفی اعظمی صاحب نے

تو میرے ہر شعر پر بے پناہ داد دیکر نوازا اور کچھ اشعار دوبارہ بھی پڑھوائے۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد انہوں نے ذاتی طور پر بھی میرے کلام کی تعریف کی۔ اور ندا بھائی کے رویہ سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ حسد کی آگ میں جل رہے ہیں

ایک دن محترم کالیداس گپتا رضا صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ "اشک میاں یہ ندا تمہارے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑا ہے؟ میں نے جواب دیا انہیں جو کچھ کرنا تھا زندگی میں کر چکے۔ اب کچھ کرنے کے لئے بچا نہیں ہے۔ اس لیے یہ نیا کام کر رہے ہیں پھر اور ان کا مقابلہ ہی کیا۔ میری تو یہ ابتدا ہے اور بہت آگے جانا ہے۔ رضا بولے لیکن ان کا یہ رویہ غلط ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اور میں نے یہ کہکر ندا بھائی کو بخش دیا

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام امرافن ہے جہاں تک پہنچے

اس وقت جب یہ معلوم ہوا تھا کہ راج کپور نے حنا فلم کے مکالمے لکھنے کے لئے ندا بھائی کا انتخاب کیا ہے تو دلی مسرت ہوئی تھی لیکن بعد میں پتہ چلا کہ ندا بھائی اس کام کو بخوبی انجام نہیں دے پائے

اور راج کپور نے یہ ذمہ داری کسی اور کو سونپ دی
"سنہرے ورق" سیریل لکھتے وقت مجھے اندازہ ہو گیا
کہ ندا بھائی کو راج نے کیوں علیحدہ کیا ہوگا۔ اس
سیریل میں پروڈیوسر نے بعد میں مومن اور دیا شنکر
نسیم کے چار مجرے
لکھوائے تھے۔ جو کافی مقبول عام ہوئے تھے۔

فن انسان کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ فن کار
جو جیتا ہے اسی کو اپنے فن کے طور پر پیش کر دیتا ہے
اگر ایسا نہیں ہے تو دیانتداری اور ایمانداری سے
گریز کرتا ہے۔ ندا بھائی کے فن اور شخصیت کے بارے میں
اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ وہ ایک ساتھ دو نہیں بلکہ
تین تین زندگیاں بیک وقت جی رہے ہیں ایک
زندگی ان کا ظاہر ہے دوسری اُن کا باطن اور
تیسری ہے اُن کا فن — جہاں اپنے ظاہر و باطن سے
وہ بالکل مختلف دکھائی دیتے ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ کچھ مضامین ہمیں تاخیر سے
موصول ہوئے جو اس نمبر شامل نہ ہو سکے جنہیں
ہم آئندہ وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہیں گے۔

ادارہ

بھی دیہات میں رہتے ہوں۔ بمبئی جائیں یا بمبئی کو
اپنے ہاں بلائیں۔ تو ندا سے ضرور ملیں۔ وہ ہاتھ
ملائے گا اور دل بھی۔ مگر شرط یہ ہے کہ آپ
اس کی دلچسپی پر پورے اتریں۔ اس سے مل کر
خوش ہوں تو میرے حق میں دعا کیجیے۔ اور ناخوش
ہوں تو تھوڑی دیر کے لئے مجھے کوس لیں اور بس

سلونی
حفیظ بھائی عرف ننھے میاں کی
آپ بیتی پر مشتمل ایک دلچسپ
داستان
عنقریب کتابی شکل میں
رابطہ:- عبدالحفیظ سرونج پوسٹ
آفس سرونج

نامی انصاری

منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

ندا فاضلی سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی مگر "شاعر" میں قسطوار ان کی خودنوشت سوانح پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں ان کو جنم جنم سے جانتا ہوں۔ ندا فاضلی سے میرا پہلا تعارف ان کے اس مشہور زمانہ شعر سے ہوا تھا۔

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہو گئی

یہ زمانہ جدیدیت کی تحریک کے اٹھان کا زمانہ تھا۔ اور اسی قسم کے مہمل اشعار سے جدیدیت کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ کانپور کے ایک ادبی جلسے میں مشہور ناقد اور جدیدیت کے امام شمس الرحمٰن فاروقی نے اس شعر کو مہمل کہہ دینے کا برا مانا تھا۔ اور کھینچ تان کر اس کا مطلب بھی بیان کر دیا تھا۔ اگرچہ مطلب اس وقت کسی کے حلق سے نہیں اترا تھا۔ بہرحال مذکورہ بالا شعر ایک لمبے عرصے تک ندا فاضلی کی پہچان بنا رہا مگر جب ان کی کا اصل منظرنامہ سامنے آیا تو سب کو محسوس ہوا کہ ندا فاضلی ایک ذہین اور منفرد لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ فی الحال میں ان کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے جذبے کو نظرانداز کر کے ان کے خودنوشت سوانح پر کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

خودنوشت سوانح نگاری ایک مشکل فن یوں ہے کہ خود اپنی کمین گاہ میں بیٹھ کر اپنا ہی شکار کرنا آسان نہیں ہوتا۔ آدمی دوسرد کے جھوٹ بول سکتا ہے مگر جب خود اپنے سے جھوٹ بولنے لگتا ہے تو اس کے اندر کا آدمی اس کو جھٹلانے لگتا ہے اس کو نظرانداز کر کے اپنے بارے میں کچھ لکھنے بیٹھتا ہے تو کچھ کر بھی اسے خالی پن یا تصنع کا احساس ہوتا ہے اور اسے صاف محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس نوع کی سوانح لکھ کر وہ دنیا کو بھی فریب دے رہا ہے اور خود اپنے کو بھی۔ اسی لئے اس فن سے وہی لوگ بخوبی عہدہ برا ہوئے ہیں جن کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اور جن میں یہ حوصلہ تھا کہ وہ اپنی پوری شخصیت کو بے کم و کاست دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ ایک سوانح عمری وہ بھی ہے جو حضرت جوش ملیح آبادی نے "یادوں کی برات"

میں پیش کی تھی جسے آپ بیتی کے بجائے "تعلی نامہ" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ندا فاضلی کی خود نوشت سوانح عمری "دیواروں کے بیچ" ایک نئے انداز کی سوانح عمری ہے جسے مصنف نے صیغہ واحد غائب میں لکھا ہے یعنی بقول غالب خود کو غیر فرض کر لیا ہے اور ندا پر اچھی بری جو کچھ بیتی ہے اسے معروضی انداز میں بیان کیا ہے

ندا فاضلی گوالیار کے ایک متوسط درجے کے خوش حال خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ان کے والد مرتضیٰ حسن سندھیا اسٹیٹ ریلوے میں ایک بڑے افسر تھے۔ اچھی خاصی تنخواہ کے علاوہ اوپر کی آمدنی تھی جس کی وجہ سے گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل تھی مگر ساتھ ہی ساتھ ان کو اس زمانے کے رئیسوں کے تمام شوق بھی لگے ہوئے تھے شاعر تھے۔ مجرے مشاعرے اور نئے نئے عشق ان کے پرانے شوق تھے۔ کئی طوائفوں سے شناسائیاں تھیں۔ گھر میں اچھی شکل وصورت کی بیوی ہونے کے باوجود سندھیا دربار کی ایک مغنیہ زیب النسا کی زلفوں کے اسیر تھے۔ اس قسم کے ماحول میں نو خیز لڑکوں اور لڑکیوں پر جو بیتتی ہے وہ ندا پر بھی بیتی۔ پڑھائی لکھائی میں رخنے پڑے آوارگی اور کج روی کی طرف پاؤں بڑھے اور پھر ان کا سایہ عمر کے بڑے حصے تک ندا پر مسلط رہا۔

خاندانی رشتوں کی پیچیدگیوں۔ محرومیوں اور محبتوں کو ندا نے بہت خوبی سے بیان کیا ہے اور ان تمام نفسیاتی عوامل پر روشنی ڈالی ہے جو اس قسم کے ماحول میں لازمی طور سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ گوالیار سے ندا کے پاؤں اکھڑتے ہیں تو دہلی کا رخ کرتے ہیں۔ دہلی کے ادبی ماحول اور مختلف شاعروں کی شخصیات اور حرکات سکنات کا بڑا دلچسپ منظر نامہ اس کتاب میں ندا فاضلی نے پیش کیا ہے خصوصاً سلام مچھلی شہری کی شخصیت کا جو مرقع انھوں نے کھینچا ہے وہ سلام کی شخصیت کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا نہ صرف پورا احاطہ کر لیتا ہے بلکہ اس زمانہ کی اشترا کی ماحول کے خط وخال بھی واضح کر دیتا ہے

اس حمام میں صرف سلام ہی اکیلے نہیں تھے بلکہ بیشتر اشتراکی کوچہ گردان میں شب و روز میں جی رہے تھے میں سمجھتا ہوں کہ "دیواروں کے بیچ" میں

خود ندا کی سوانح سے زیادہ کشش خیز و سرد کیے دلچسپ مرقع ہیں جن میں صرف ادیب و شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ نچلے طبقے کے عام آدمیوں اور عورتوں کے علاوہ پہلوان حسرد بھائی بھی ہیں جن کا المیہ یہ ہے کہ ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر میں ایک مرتبہ کے بعد دوبارہ وہ ایک بھرپور بکھری ہوئی عورت کو اس کے بستر پر سمیٹنے میں ناکام رہ کر اس کی گالی بھی کھاتے ہیں اور اپنی عمر کی فطری بے بسی پر آنسو بھی بہاتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو دیواروں کے بیچ میں "آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی کے دلچسپ مرقع دامن دل کو کھینچتے ہیں۔ یہاں ندا کا مشاہدہ اور اس کے بیان کرنے طریقہ دونوں ہی فردوس نظر بن جاتے ہیں۔ مرقع نگاری میں ندا کو بڑی مہارت حاصل ہے وہ ان مرقعوں کے زشت و خوب دونوں پہلوؤں میں رنگ بھر کر انہیں پر کشش بنا دیتے ہیں۔ ان کا بیباک قلم پردہ داری کا نہیں پردہ دری کا قائل ہے مگر ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے اسلوبی کنایوں سے جنسی منظر نگاری میں بھی عریانیت کے الزام سے خود کو بری کر لیتے ہیں ان کی انانیت زخم خوردہ نہیں ہے اور نہ وہ اپنی کمزوریوں کو نیلی کے پردے میں چھپاتے ہیں۔ اسی لئے ان کی سوانح میں ایک ایسی فطری کشش ہے جو خود نوشت سوانح عمری کے مروجہ طریقوں سے بالکل الگ ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ قسطوں میں پڑھنے کی وجہ ہے اس کے تمام پر کشش اجزا کو میں اس مختصر مضمون میں سمیٹ نہیں پایا ہوں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ جب مکمل کتاب سامنے آئے گی۔ تو ادبی حلقوں میں اس سے کافی ہلچل پیدا ہوگی۔

نامی انصاری

امپیریل ہوٹل
ہر طرح کی لذیذ مٹھائیوں کا واحد مرکز
چھوٹا بازار سرونج
پروپرائٹر خلیل احمد

ندا فاضلی سے ایک انٹرویو

محمد خالد عابدی آل انڈیا ریڈیو
بھوپال

محمد خالد عابدی :- ندا صاحب! آپ کی تاریخ اور جائے پیدائش کیا ہے؟

ندا فاضلی :- دہلی - ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۳۸ء

محمد خالد عابدی :- کیا شاعری آپ کو ورثے میں ملی ہے؟

ندا فاضلی :- میرے والد دعا ڈبائیوی، نوح ناروی کے شاگرد تھے - ان کے دو شعری مجموعے تاثر دعا، اور تصویر دعا کے نام سے شائع ہوئے تھے

محمد خالد عابدی :- آپ نے اپنے ابتدائی کلام پر کس سے اصلاح لی تھی - اور باقاعدہ استاد کون تھا؟

ندا فاضلی :- کسی سے نہیں -

محمد خالد عابدی :- آپ کی پہلی تخلیق کس صنف میں تھی اور وہ کب اور کہاں شائع ہوئی؟

ندا فاضلی :- پہلی تخلیق نظم تھی - جو سریتا کے اردو ایڈیشن میں شائع ہوئی تھی -

اس کے آخری دو مصرعے یوں تھے

سائے کو چھونا سائے کو کھونا ہے
سندرتا کا پیار جنم کا رونا ہے

محمد خالد عابدی :- آپ نے اپنا تخلص (ندا فاضلی) کس مناسبت سے اختیار کیا تھا کیا اس تخلص سے پہلے بھی آپ نے کوئی اور تخلص کیا تھا -

ندا فاضلی :- فاضلی خاندانی سرنیم ہے یہ ہی پہلا اور آخری تخلص ہے -

محمد خالد عابدی :- آپ ادب سے فلموں میں کس طرح چلے آئے - آپ فلموں میں شوقیہ گیت لکھ رہے ہیں یا ضرورتاً؟

ندا فاضلی :- فلموں میں بقول شاد عظیم آبادی
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں - کمال امروہوی نے جان نثار اختر کی وفات کے بعد مجھے گیت لکھنے کے لئے بلایا تھا راجندر سنگھ کے ایک چیف اسسٹنٹ نے انہیں دنوں میری کتاب "ملاقاتیں" پڑھ کر مجھ سے فلم "سوبکارئیں" (جسے سدھیندر رائے نے ڈائرکٹ

کی تھی۔

محمد خالد عابدی:۔ آپ نے پہلی بار کس فلم میں گیت
لکھے تھے۔ کیا آپ اس فلم میں
تنہا گیت کار تھے یا ساتھ میں
اور کوئی بھی گیت کار تھا۔ آپ
کی اس پہلی فلم میں آپ کے کتنے
گیت تھے اور ان کے مکھڑے کیا تھے

ندا فاضلی:۔ پہلی بار جس فلم میں گیت لکھے تھے
اس کا نام "شاید" تھا اس میں
میرے ساتھ دوسرے لکھنے والے
وٹھل بھائی پٹیل تھے۔ گیتوں کے
مکھڑے یوں تھے

خوشبو ہوں میں پھول نہیں ہوں
جو مرجھاؤں گا
جب جب موسم لہرائے گا
میں آ جاؤں گا

دن بھر دھوپ کا پربت کاٹا
شام کو پینے نکلے ہم
جن گلیوں میں موت چھپی تھی
ان میں جینے نکلے ہم

محمد خالد عابدی:۔ آپ نے اپنی پہلی فلم میں جو گیت
غزل، نظم، لکھے تھے وہ پہلے سے
تفویض قلم ہو چکے تھے یا فلم میں
سچویشن کے مطابق وہ گیت
لکھے گئے تھے؟

ندا فاضلی:۔ گیت عام طور سے میوزک ڈائریکٹر
کے ساتھ ہی لکھا جاتا ہے دی
ہوئی سچویشن کے مطابق
ہی گیت لکھے جاتے ہیں

محمد خالد عابدی:۔ فلموں میں گیت لکھنے کے لئے
ضروری ہے کہ شاعر موسیقی سے
بھی واقفیت رکھتا ہو۔ کیا آپ
اس امر سے اتفاق فرماتے ہیں
تو کیا محترم نے بھی موسیقی کی تعلیم
وغیرہ حاصل کی ہے؟

ندا فاضلی:۔ گیتوں کے لیے طرز دھن اوزان
کی واقفیت ضروری ہے میں نے
موسیقی کی تعلیم تو حاصل نہیں کی
لیکن ساز، آواز کے اتار چڑھاؤ
سے ضرور واقف ہوں

محمد خالد عابدی :- کیا آپ کی وہ تخلیقات بھی فلموں
میں آ گئی ہیں جو کہ آپ نے
فلموں کے لیے نہیں لکھی تھیں اُن
کی کچھ تفصیل۔

ندا فاضلی :- پہلے سے لکھی ہوئی کوئی تخلیق
پورے طور پر فلموں میں نہیں آئی
فلم آپ تو ایسے نہ تھے میں
تو اس طرح میری زندگی میں شامل ہے
گیت کی پہلی چار لائنیں میری
ایک نظم دعا کی ہیں۔ باقی کا
گیت مجھے طرز سچویشن کے
مطابق لکھنا پڑا۔ اس طرح فلم
آہستہ آہستہ میں میری کتاب
مور ناچ میں شامل ایک غزل سے

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں کہیں آسماں نہیں ملتا

کو کچھ مصرعوں کی تبدیلی کے ساتھ
ہی لیا گیا تھا۔ مثلاً اس میں ایک
انترہ یوں ہے۔

ترے جہان میں ایسا نہیں کہ پیار نہ ہو / جہاں امید ہو اسکی وہاں نہیں ملتا

کتاب "مور ناچ" میں یہ شعر یوں ہے

تمام شہر میں ایسا نہیں خلوص نہ ہو
جہاں امید ہو اسکی وہاں نہیں ملتا

محمد خالد عابدی :- آپ نے گیت اور فلمی گیت کی
کیا تعریف متعین فرمائی ہے؟

ندا فاضلی :- میں نے اس سلسلے میں ماہنامہ
آج کل کے فلم نمبر میں ایک
تفصیلی مضمون لکھا تھا۔

محمد خالد عابدی :- عام طور پر موسیقار مدن موہن
اور موسیقار روی کے حوالے سے
کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جن فلموں
میں غزلیں استعمال کی ہیں تو وہ
غزلیں، غزل کے شاعر سے ہی
لکھوائی ہیں۔ کیا آپ دونوں موسیقاروں
کے ساتھ اس سلسلے کا کوئی تجربہ
وغیرہ ہے۔

ندا فاضلی :- مدن موہن اور موسیقار روی کے
ساتھ میں نے کام نہیں کیا۔

محمد خالد عابدی :- آپ نے ابھی تک کل کتنی فلموں کے

گیت لکھے ہیں؟

ندا فاضلی :- فہرست تیار کرنا مشکل ہے۔ کچھ
فلموں کے نام یوں ہیں رضیہ
سلطانہ، شاید، بیوی اور بیوی
آہستہ آہستہ، کنواری بہو، امیر
آدمی غریب آدمی، چور پولیس
آپ تو ایسے نہ تھے، جان وفا
ایک نیا رشتہ، عادت سے مجبور،
سویکار کیا میں نے۔ لیلیٰ انا خدا
وغیرہ

محمد خالد عابدی :- کیا آپ اپنے کسی فلمی گیت کی شان
نزول کے بارے میں بتا سکتے ہیں؟

ندا فاضلی :- فلمی گیتوں کی شان نزول کیا ہو سکتی ہے
یہ ایک میکانکی عمل ہے۔ جو ساز اور
آواز کے ساتھ شعوری طور پر چلتا ہے۔

محمد خالد عابدی :- کیا ایسے بھی موسیقار ہیں جن کے ساتھ
آپ گیت لکھنے کا اشتیاق رکھتے
ہوں؟

ندا فاضلی :- مجھے موسیقاروں کے ساتھ لکھنے کا
اشتیاق نہیں رہا۔ اکثر موسیقاروں
ہی نے میرے ساتھ لکھنے کی
خواہش ظاہر کی۔

محمد خالد عابدی :- عام طور پر فلموں میں اس طرح
کی روایت ملتی ہے کہ کسی فلم
کو دو ڈائرکٹروں نے مل کر
پوری کی، پہلی موسیقار کے
علاوہ دوسرے موسیقار کو لیکر
فلم مکمل ہوئی۔ دوسرے ہیرو
کو لے کر فلم کی تکمیل ہوئی کیا
گیت کاروں کے ساتھ بھی
اس طرح کا کوئی اتفاق ہوا ہے

ندا فاضلی :- بارہا ایک فلم میں دو یا تین گیت کار
ہوتے ہیں میں نے بھی ایسی فلموں
میں لکھا ہے۔

محمد خالد عابدی :- فلمی گیت کاروں کے یہاں یہ روایت
بھی ملتی ہے۔ کہ انہوں نے اپنے فلمی
گیتوں کے مجموعے بھی شائع کئے ہیں
جیسے کدار شرما کا مجموعہ "پنچھی" ساحر لدھیانوی
کا مجموعہ گاتا جائے بنجارہ، شکیل
بدایونی کے مجموعے دھرتی کو آکاش

پکارے، "اور "کہیں دیپ جلے
کہیں دل" حسرت جے پوری کا
مجموعہ "چشم بد دور" اور
کیفی اعظمی کا مجموعہ "میری آواز سنو"
(دیوناگری رسم الخط میں) کیا
آپ اس سلسلے کو پسند فرماتے
ہیں۔ اور مستقبل میں کیا آپ
بھی فلموں کے گیتوں کا کوئی
مجموعہ پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

ندا فاضلی :- ابھی تو مجھے اپنے شعری مجموعے
شائع کرنے سے فرصت نہیں جب
جب ان سے فراغت حاصل ہوگی
تو فلمی گیتوں کو شائع کرنے کی
سوچوں گا۔

محمد خالد عابدی :- راجہ مہدی علی خاں، ساحر
شکیل اور جان نثار اختر
جیسے اچھے (اردو کے) فلمی
گیت کار رحلت فرما گئے کیا
فلمی دنیا ان کی اس کمی کو
محسوس کرتی ہے۔
اور اس نے کیا ازالہ کیا ہے؟

ندا فاضلی :- شاعر اپنی جگہ اہم ہوتا ہے لیکن
یہ چلتی پھرتی دنیا ہے۔ کسی کا سوگ
یا کمی بہت دنوں تک محسوس نہیں
ہوتی ایک جاتا ہے ایک آتا ہے
یہ ہی زندگی ہے۔

(بقیہ رفیعہ شبنم)

خواب کے درمیان سے گزرتے ہوئے ندا ہی کا
شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے

گزرو جو باغ سے تو دعا مانگتے چلو
جس میں کھلے ہیں پھول وہ ڈالی ہری رہے۔ ○

شادی وغیرہ کی تقاریب میں
ضرور یاد رکھیں
پپو ساؤنڈ سروس
اینڈ ٹینٹ ہاؤس
رٹیہ سرونج (ایم پی)

ساحر لدھیانوی

"ساحر صاحب، آج موسم کچھ زیادہ گھٹا گھٹا سا ہے۔"

"ہاں ہاں موسموں کی گھٹن کا تلخیاں میں کئی جگہ ذکر ہے۔"

"آج کل مارکیٹ میں جاپانی گھڑی ڈیکو بہت سستی مل رہی ہے۔"

"جی ہاں، تلخیاں میں اسمگلنگ پر کافی گہرے طنز مل جائیں گے۔"

"آزادی کے بعد اردو کتابوں کی مارکیٹ بہت کم ہو گئی ہے۔"

"نہیں صاحب، تلخیاں کے اکتیس (۳۱) سے زائد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔"

"اشیاء کی قیمتیں دن بدن آسمان کو چھو رہی ہیں۔"

"صحیح ہے، لیکن جب تلخیاں کا پہلا ایڈیشن لاہور میں چھپا تھا، اس وقت حالات ایسے نہیں تھے۔"

تلخیاں .... تلخیاں ..... تلخیاں .... ساحر لدھیانوی سے بات چیت کرنے کے لئے ایٹینگ دے کے بوڑھے پھیرے جیسے Patience کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اتفاق سے آپ ان کے فلیٹ میں ہی بیٹھے ہوں تو یہ ضرورت مجبوری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یوں بھی ساحر کے ملنے جلنے والے عام طور سے وہی لوگ ہوتے ہیں جو ساحر سے کم ساحر کے بینک بیلنس، فلیٹس اور ساحر کی شراب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ لیکن ایک بار ایک ایسے صاحب بھی ساحر سے ملنے چلے آئے جو شاید بمبئی میں نئے نئے آئے تھے اور صرف ساحر سے ہی ملنا چاہتے تھے۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔ ابھی وہ مشکل سے چند منٹ ہی بیٹھے ہوں گے کہ وہسکی کے تین پیگ چڑھائے ہوئے ساحر کی اجازت کے بغیر، ساحر کے بینک بیلنس نے انہیں دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ بیچارے نئے نئے تھے، اگر جان کار ہوتے تو دوسروں کی طرح وہ بھی فلمی شہرت اور ادبی مقبولیت میں امتیاز کرنے کی بھول نہیں کرتے۔

ساحر کی تلخیاں کے کتنی ایڈیشن چھپ چکے ہیں لیکن ساحر پیدائش سے لیکر اب تک ایک ہی ایڈیشن میں چل رہے ہیں۔ ساحر دراصل اپنے آپ کو نہ بانٹنے کی کشمکش کے شکار ہیں۔ وہ پیر کے انگوٹھے سے سر کے بالوں تک پورے جڑے ہوئے ہیں۔ ابھی تک جڑے ہوئے ہیں مگر جڑا ہوا آدمی ٹھیک وقت پر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنا شروع نہ ہو تو شخصیت میں نئی نئی گتھیاں پڑ جاتی ہیں۔ ساحر کا سب سے بڑا المیہ انکی یہی سالمیت ہے، جس نے ان کے اندر نرگسیت کی گرہ ابھار دی ہے۔ ساحر کی عمر بھلے ہی کچھ ہو لیکن ذہنی طور پر وہ ابھی تک پندرہ سولہ سال والے

کھلنڈرے پن میں ہی سانس لے رہے ہیں۔
ساحر کی گفتگو کا پسندیدہ موضوع سیاست اور جادو
ہی ہے۔ اس موضوع کی خشکی کو وہ طرح
طرح کے اچھے برے لطیفوں سے کم بھی کرتے
رہتے ہیں ایسا نہیں ہے ساحر کو اپنی اس
کمزوری کا علم نہ ہو۔ لیکن رات دن محفلوں
اور مجمعوں میں گھومنے والا ساحر اپنے اکیلے پن
کے شدید احساس کے شکنجوں میں اس بری
طرح پھنسا ہوا ہے کہ اب باوجود شعوری کوشش
کے بھی وہ اس سے چھٹکارا نہیں پا سکا۔ ساحر
قدرت کی ظرافت کا انتقام اپنے ارد گرد کے
ماحول سے لینا چاہتے ہیں۔ لیکن ہنگ ود و کی
علمی دنیا میں جب وہ تین کروڑ کی بھیڑ میں اپنے
آپ کو ایک اکائی کی حیثیت میں پاتے ہیں تو
سوائے بے معنی جھلاہٹوں کے انکے سامنے
کوئی دوسرا راستہ نہیں رہتا، ساحر کی
جھلاہٹیں ساحر کا مرض ہیں۔ ساحر کے یار دوست
ان کمزوریوں کے ساتھ ساحر کو گوارہ بھی
کرتے ہیں۔ ہوش میں تو وہ تجارتی مصلحتیں نبھا
بھی لیتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی دو تین پیگ اندر
اترتے ہیں، خود ساحر کیلئے اپنے آپ کو سنبھالنا
مشکل ہو جاتا ہے۔ ساحر کو فلموں میں کافی تگ
و دو کرنی پڑی ہے۔ کرشن چندر کے وارڈن

میں بستر پہ کھانسو پڑا ہے، فلمسازوں کے آگے
پیچھے پھرنا پڑا ہے، میوزک ڈائریکٹروں کے گھروں
کے برسوں طواف کرنے پڑے ہیں — کہیں جا کر
رئیسانہ ٹھاٹ کے دن دیکھنے کو ملے ہیں۔
ماضی کی تلخ یادوں نے انہیں کسی حد تک۔۔۔
SADIST بھی بنا دیا ہے۔ دوسروں کے منہ پر برا بھلا کہ
کر، اور ضرورت مندوں کو بار بار اپنے گھر کے بے مقصد
چکر کٹوا کر انہیں اب سکون بھی ملتا ہے۔ ساحر کے پاس
جو بھی جاتا ہے کسی کام کے لئے، کبھی مایوس نہیں ہوتا مگر
جھوٹے وعدے کرنا اور مہینوں دوسروں کو ان میں الجھائے
رکھنا انکی مخصوص ہوبی بھی ہے۔ ان بے مقصد چکر کاٹنے
والوں کی مجبوریوں سے وہ نئے لطیفے تراش کر اپنی شام
کی محفلوں کو رنگین بھی بناتے ہیں۔ ساحر کو اپنے ہاتھ سے
پیسے دینے میں مزہ آتا ہے۔ لیکن اگر کہیں کسی کا روزگار
لگ رہا ہو تو اس میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے کو
بھی وہ کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ لیکن ان تمام
کمزوریوں کے باوجود ساحر اس الٹے سیدھے سماج
میں زندگی کرنے سے واقف ہیں۔ وہ نئی نئی
controversies میں الجھ کر دوسروں کو ہمیشہ اپنی
طرف متوجہ کئے رہتے ہیں۔
کسی سے بار بار ملئے اور بھول جائیے اور پھر
اچانک اسکے بارے میں سوچنے لگئے۔ نہ جانے کہاں کہاں
ذہن لے جاتا ہے۔
ٹوٹی ہوئی زنگ لگی تلوار، بکھرے گول گول

اُگے ہوئے، سرکنڈوں کے سوکھے کھیت، پیلی ململ کے
ہلکے گہرے دوپٹے، پیتل کی ترازو اور دور دور تک
پھیلا ہوا اندھیرا...... عجیب عجیب رنگ پیچھے
ہیں، نئی نئی تصویریں ابھر کر آتی ہیں۔ ہر تصویر
اپنے طور پر مکمل، مگر دوسری تصویر سے مختلف۔

اور پھر سب رنگ اور تصویریں مکمل مل کر ایک بالکل
نئی تصویر کا روپ دھار لیتی ہے۔ مسکراتی ہوئی
ایک بڑی سی تصویر۔ نہ جسم، نہ ہاتھ، نہ پیر،
نہ ناک...... لیکن ایک مکمل اور زیادہ بھی
تصویر......

ساحر سے ملنے سے پہلے میں بھی فلمیاں کے سرورق
پر چھپی ہوئی چوڑی پیشانی، چیچک کے داغ
گمبھیر آنکھوں اور ضرورت سے لمبی ناک کو ہی
[illegible] ...... لیکن...... کیمرہ کی آنکھ
ہو تو [illegible] دھوکہ باز ہوتی ہے۔

[illegible] جب آپ تک پہنچنا بہت کٹھن ہوتا
ہے [illegible] پریشان ہونا پڑا تب کہیں
[illegible] ملاقات ہو پائی ہے اور اسے بھی اتفاق
کہیے کہ کال اسٹوڈیو سے میں نے پوچھی نمبر لگا دیا تھا
شاید آپ کے اسٹوڈیو کا نام سن کر آنے ہونے کا اعلان
کر دیا ہو۔ ویسے عام طور پر آپ باتھ روم سے باہر ہی
[illegible] سے اسے فرصت کہاں؟ میرے گیت
[illegible]
[illegible] نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ دیر سے ملے تھے

سے عجیب عجیب پریشانیوں میں مبتلا ہوں۔ گھر میں
بہت کم رہا ہوں پہلے کرشن چندر اچانک بیمار
ہوئے اور پھر میرے ایک ہم جماعت علیل ہو گئے۔
جنہیں امریکہ علاج کے لیے روانہ کرتا تھا۔ زیادہ وقت
پیسہ جٹانے کی دوڑ دھوپ میں ضائع ہوا۔ جو کچھ
کمایا تھا وہ مکان کی تعمیر میں لگا دیا تھا۔ اب تو معاف
کیجیے...... ساحر اپنی ادھوری بات چھوڑ کر ٹیلی
فون ٹیبل کی طرف اٹھ کر چل دیتے۔

"ہلو...... جی میں ساحر بول رہا ہوں۔
کون؟ اچھا کہیے کیسے ہیں۔ جی جی۔ ارے کب
......؟ اسپتال میں داخل کر دیا ہے۔ آپ کی بیوی
......!! سو روپے...... بہتر ہے...... بھیجے دیتے
ہیں۔ اچھا میں ابھی دیئے دیتا ہوں۔ فون رکھ کے
رکھے گئے"

ریسیور نیچے رکھ کر ساحر اندر کمرے میں گئے اور
دو تین منٹ کے بعد واپس آکر جیسے ہی ریسیور اٹھایا
اُن کا چہرہ جو کچھ لمحے پہلے نہایت سنجیدہ اور فکر مند تھا
اچانک مسکرا اٹھا۔ لیجیے سما صاحب، موصوف فرما
رہے ہیں ساحر کو بے وقوف بنا دیا۔ کیا خوب، تھوڑی
دیر بعد اس کا اظہار کرتے تو کیا بگڑ جاتا۔ شاید کسی
ساتھ والے سے بات کر رہے ہیں۔ مگر فون پر آواز
صاف سنائی دے رہی ہے۔

ساحر کافی دنوں تک فلموں کے کامیاب گیت کار
رہے ہیں۔ فلموں میں گیت لکھنا تو کوئی زیادہ کٹھن نہیں تھا

ہاں گیت لکھنے کے مواقع حاصل کرنا نہایت مشکل ہے طرح طرح سے ڈھنڈورا پیٹنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جاکے فلم سازوں کو گیت کار کی صلاحیتوں کی اطلاع ملتی ہے ساحر اس رائے سے واقف ہیں۔ ان کا ذہن ایسی کہانیاں گڑھنے میں زیادہ خلاق ہے جس کے ہیرو وہ خود ہی ہوسکتے ہیں۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ہاں تو کہا، آپ فرمایئے۔ ساحر قہقہہ لگاتے ہوئے سگریٹ سلگا رہے تھے۔ وہ کہاں سے بات چھوڑ کے گئے تھے اب انہیں یاد نہیں تھا۔ کبھی کبھی ادھوری بات بھی کتنی مکمل ہوجاتی ہے۔

ساحر کا مکان کافی کشادہ ہے۔ بمبئی میں جن کے پاس پیسہ ہوتا ہے وہ پانچ چھ فلیٹوں کی جگہ کو ایک فلیٹ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اور پھر ساحر کی تو پرچھائیاں کے نام سے پوری بلڈنگ ہی ہے۔ پچھلے دنوں سجاد ظہیر نے جب مہندر ناتھ سے ترقی پسند تحریک کو از سر نو منظم کرنے کو کہا تو مہندر ناتھ نے نہایت سنجیدگی سے کہا: بنے بھائی جو لوگ ترقی پسند ہیں ان کا سوشلزم تو بہ کا رُکا ہے۔ آپکے ذہن میں جو سوشلزم کا تصور ہے وہ توان کے لئے اب نقصان دہ ثابت ہوگا۔ ... بھلا اس تحریک سے کیا فائدہ؟

ساحر کے مجموعہ کلام تلخیاں کے پہلے ایڈیشن میں لفظ کے طور پر کچھ شعر درج تھے جو بعد کی اشاعتوں میں ترمیم و اضافہ کا شکار ہوگئے۔ انہیں میں یہ شعر بھی شامل تھا۔

رجعت پسند ہوں نہ ترقی پسند ہوں
اس بحث کو فضول و عبث جانتا ہوں میں

ساحر بنیادی طور سے ہلکے پھلکے رومانی شاعر ہیں۔ ان کا لہجہ، جو فیض کا تقلیدی رنگ لئے ہوئے ہے، نیم پختہ ذہنوں کے لئے خاص دلکشی رکھتا ہے۔ ان کے یہاں نوجوانی کے کھلنڈرے پن کا سیدھا سادا اور وضاحتی اظہار کالج کے لڑکے لڑکیوں میں ایک زمانہ میں کافی مقبول رہا ہے۔ محنت و سرمایہ کی فارمولائی کشمکش کے ساتھ بیان اور محبت کے غیر تجرباتی ارشادات نے ان کے اشعار میں QUOTABILITY کا حسن تو ابھار دیا ہے، اگر ... مشاعروں کے سامعین اور آزادی سے پہلے کے ... کم عمر لڑکے اور لڑکیوں کے رومانی خطوط ... محدود ہے۔ ساحر کی پوری شاعری انفرادی تازگی کے بجائے تقلیمی فرسودگی لئے ہوئے ہے جس میں جگہ جگہ اپنے عہد کے فیشن کی چھاپ نمایاں ہے۔ مجاز اپنی موت سے کئی سال پہلے، "آوارہ" میں جس ذہنی پختگی تک پہنچ گئے ساحر ہنوز اس سے بھی کوسوں دور ہیں اور یہ ہی ان کی فلمی و ادبی مقبولیت کا راز بھی ہے۔

"ساحر صاحب، ترقی پسندی ایک تنقیدی اصطلاح کے طور پر پچھلے تیس پینتیس سال سے رہ ... ہے۔ وہ تمام شاعر جو اس دور میں

ابھر کر سامنے آتے ہیں ان کو اسی علامت سے پہچانا جائے
گا، حالانکہ ان شاعروں کو اپنے انداز، اسلوب اور
شخصی رجحانات کے لحاظ سے کئی خانوں میں بانٹا جا
سکتا ہے۔

۱۔ فیض اور مخدوم ۲۔ سردار جعفری اور
نیاز حیدر، کیفی اعظمی ۳۔ مجاز، جذبی اور جاں نثار
۴۔ سلام مچھلی شہری، ساحر لدھیانوی اور قتیل شفائی
...... ان میں سے کس گروپ پر ترقی پسندی کا زیادہ
اطلاق ہوتا ہے، یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں۔ لیکن کیا
آپ اس تنقیدی میکانکیت سے متفق ہیں جس
میں اچھی اور بری شاعری کے فرق کو نمایاں کرنے
کے بجائے شعری تخلیقات کو صرف نظریاتی اور
موضوعاتی رخ سے پہچانا جاتا ہے؟ آپ مزاجاً ان میں
سے کس گروپ سے زیادہ قریب محسوس کرتے
ہیں؟"

"جہاں تک میرا تعلق ہے میں اپنے آپ کو فیض
اور مجاز سے زیادہ قریب پاتا ہوں۔ سلام مچھلی
شہری کے ہاں جدت ہے۔ موضوعات کا پھیلاؤ
بھی ہے۔ اس نے ہیئت اور موضوع میں تجربے
بھی کئے ہیں۔ اچھی شاعری بھلے ہی کسی مخصوص
نظریہ پر پوری نہ اترتی ہو، لیکن اس سے اس کی
عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر اقبال سے شدید
ترین نظریاتی اختلاف کے باوجود اُن کی شاعرانہ
عظمت کا معترف ہوں۔ لکھتے وقت ہر ادیب کو
اپنی شخصیت کے ساتھ سچا رہنا چاہئے۔ جو کچھ بھی کہا
جائے اس میں ضمیر کی شرکت ضروری ہے۔ یعنی
اندر سے بھی کچھ ایسا لگتا ہو۔ نہیں تو اَن کہی بات اندر
ہی اندر گولا بن جائیگی۔ جو کچوکے دیگی۔ شعر کہنے کے
بعد اس پر کونسا لیبل چسپاں کیا جائیگا، یہ ادیب
کی نہیں لیبل فروشوں کے سوچنے کی بات ہے۔ ادب
درحقیقت شخصیت کے اظہار کا نام ہے۔ یہ ایک تخلیقی
عمل ہے۔ اگر وہ اپنے مزاج کے خلاف کسی لیبل کے
لئے لکھتا ہے تو اسے کوئی تسکین نہیں ہوگی۔ آزادی
سے ساڑھے تین سال پہلے ایک چھوٹے سے شاعر کا
مجموعہ 'تلخیاں' شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک نظم 'خود
کشی سے پہلے' بھی شامل ہے۔ اس مجموعے کے بعد میں
کئی اصلی اور جعلی ایڈیشن چھپ کر بک چکے ہیں۔"

ساحر بولتے وقت ہاتھ کے اشاروں اور چہرے
کی کیفیتوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ جب یہ کام دیتے
نظر نہیں آئیں گے تو کھڑے ہو کر ذرا آواز اونچی کرکے
بولیں گے۔ اگر سننے والا پھر بھی مطمئن نہ ہو تو آخر حربہ
کے طور پر ایک خاص قسم کے پنجابی قہقہے کا استعمال
کرینگے اب آپ کی مرضی ہے جو اب بھی قائل نہ ہوں۔
وہ تو اپنی بات مکمل کر چکے۔ اب آپ ہی کوئی دوسری بات
چھیڑیں تو وہ بولیں۔ نہیں تو...... آدھی سے زیادہ سگریٹ

بجھانے میں مشغول ہو جائیں گے۔ یا سگریٹ کا پیکٹ آگے بڑھا دیں گے۔ لیکن سگریٹ پیش کرتے وقت یا کوئی شعر پڑھتے ہوئے ذہنی عظمت کی چمک آپکی آنکھوں میں ضرور دیکھتا رہا ہوں گے۔

"ساحر صاحب تلخیاں کی بیشتر نظمیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے، آپنے اپنے معاصرین میں فیض سے زیادہ متاثر ہیں۔ موضوع اور اسلوب دونوں میں یہ اثرات نمایاں ہیں۔ لیکن ان اثرات کی رو فیض کی ابتدائی دور کی نظموں تک ہی محدود ہے۔

پرچھائیاں (ساحر کی طویل نظم) سے پہلے کی نظموں کی کینوس بھی فیض کی ان نظموں کی طرح چھوٹی ہے۔ وہی ایک نو عمر عاشق ایک حسین محبوبہ اور درمیان میں کھڑا ہوا کوئی سرمایہ دار جو دولت سے محبوبہ کا مول تول کرکے بیچارے عاشق کو خود کشی کرنے کے لئے چھوڑ جاتا ہے۔ انہیں تین کرداروں کو رومانوی انداز میں دہرایا جاتا ہے۔ کہیں غربت کے کارن محبت ٹوٹتی ہے کہیں سماج بیچ پڑ جانے سے ناطہ ٹوٹتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کا لہجہ خاص عمر میں بہت مانوس اور پر کشش لگتا ہے۔ جو میں اس قسم کی رومانوی کشش الفاظ کو موضوع کے متعارف ... تک ہی محدود رکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ باقی مشاعری کے ... موضوع ہوتا ہے۔ جب کہ آپکے یہاں یہ عمل دو متضاد ... یکجا کرنے کی شعوری کوشش سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ شاعر کی شخصیت کی بھی کہیں گہرا، کہیں تہہ دار اور کہیں یک سمتی ہوتا ہے۔ اس میں لفظی تزئین سے نہیں، اس شخصیت کی تزئین سے کام چلتا ہے۔ جو خود الفاظ کے مخصوص انتخاب اور وزن بحر کے برتاؤ میں شامل ہو جاتی ہے۔ آپکی نظموں شہکار، تاج محل، نور جہاں اور پرچھائیاں آپ ہی کی دیگر نظموں سے الگ لگتی ہیں۔ ان میں فیض کی ابتدائی نظموں کے اثرات بھی کم کم نظر آتے ہیں۔ ان نظموں کو پسند کرنے والوں میں شاید عمر کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ لیکن یہ نظمیں بھی روایتی انداز لئے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے موضوع کو الفاظ کی چھوٹی چھوٹی کیلوں سے ایک خاص ترتیب سے جڑ دیا گیا ہے۔ کوئی لفظ بھی دائیں بائیں نہیں ہٹایا جا سکتا۔"

"میں عمر کے لحاظ سے صرف کیفی کو چھوڑ کر اپنے معاصرین میں سب سے چھوٹا ہوں۔ فیض، سردار، نیاز سب مجھ سے سینئر ہیں۔ مجاز کا آہنگ جب شائع ہوا تھا اس وقت میں میٹرک کا طالب علم تھا اور فیض کے مجموعے کی اشاعت کے وقت میں بی۔ اے میں پڑھ رہا تھا۔ میری کچھ نظموں میں فیض کے اثرات ضرور ہیں۔ مجاز کے ہاں کلاسی رچاؤ ہے، وہ مجھ میں ہے۔ شاید پچھلے میں اس کا اثر ہو۔ ہر شاعر اپنے بزرگ شاعروں سے متاثر ہوتا ہے۔ لیکن سرقہ اور اثرات میں فرق ہے۔ میری کئی نظموں کے موضوع 'تاج محل'، 'پگھلے'، 'گریز'، 'خوبصورت موڑ'،

۔ وغیرہ مختلف ہیں۔ سو فیصدی اور مکمل تو کوئی نہیں ہوتا۔
فیض کے ہاں تشبیہات زیادہ ہوتی ہیں۔ میری
نظموں میں صفات Adjectives سے فضا پیدا
ہوتی ہے۔ شاعر کی خود کی شخصیت اس کے فن اور
اسلوب پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک اپنا حلقہ ہوتا ہے۔ اسی کے
مطابق موضوع اور اسلوب کوئی شکل اختیار کر لیتا ہے۔
میں مزاجاً متوسط طبقے کا فرد ہوں۔ شاید اب تک ڈی کلاس
(DE-CLASS) نہیں ہو پایا۔ برسوں پہلے میری نظمیں مرد لکھو
میں خاموشی سے سُن لی جاتی تھیں۔ لیکن تالیاں کبھی کو زیادہ
ملتی تھیں۔ بعض لوگوں کی رائے ہے۔ "ساحر کالج کے لڑکے
لڑکیوں میں زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ یہ نیم پختہ ذہن کی شاعری
ہے"۔ لیکن مجھے ایسا سوچنے والوں کے ذہن کی کچّھی پر شکہ
ضرور ہوتا ہے۔ میں اسی ماحول سے نکلا ہوں۔ اس سے دیتہ
ہونا فطری ہے۔ لیکن شاعر کی عمر کے ساتھ شاعری
کے موضوعات اور ان کا برتاؤ (TREATMENT)
بھی بدلتا ہے۔ ہمارے زمانے میں حفیظ اور عدم بزرگ
شاعروں میں بہت پاپولر تھے۔ ہم بھی مشاعروں
شریک ہوتے تھے انہیں کے ساتھ پڑھتے تھے اور زیادہ لینا
کئے جاتے تھے۔ آج بھی فراق کہتے ہیں کہ مشاعروں
کے ٹکٹ تو ساحر کے نام پہ بکتے ہیں"۔
"لیکن ساحر صاحب، مشاعرہ کی خاموشی یا تالیاں تو
اچھی بری شاعری کی کسوٹی نہیں بنائی جا سکتی۔ غالب پسند

سکے چلانے والے شاعر ہوئے ہیں۔ فانی، حسرت، یگانہ کے
مقابلہ میں آج اردو کی چیتیں پہاڑ دیتے تھے۔ ہندی کے اب
شاعر لگے ہے کر دھرم ویر بھارتی اور سرویشور دیال
تک نیرج کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ ٹی۔ ایس
ایلیٹ، ملارمے، بییت پرس اور بودلیر وغیرہ کو
اس کے عہد میں ہی بنا تشریحات کے کہاں سمجھا گیا۔
فرانس اور یورپ کے دوسرے علاقوں میں تو مشاعرہ عام
کی چیز یا ہی ختم ہے۔ تو کیا وہاں اچھی شاعری پیدا ہونے
کا امکان نہیں۔ پچھلے دنوں بمبئی کے ایک مشاعرہ میں
شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی سے زیادہ سامعین
نے ایک سستے شاعر کو پسند کیا۔ کبیر، آہنگ اور نکارام
کے سامعین اور مشاعرہ سننے والوں میں فرق ہے۔ صوفی
شعراء اور مذہبی پیشوا کے ارد گرد بیٹھنے والوں مخصوص
عقائد کی سطح پر ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں مشترک
اقدار کا وجود ترسیل کے لئے بہت ضروری ہے۔ اور پھر
ان کے کلام کی مقبولیت عقیدہ تمندانہ ہے۔ ان کے عقیدت
مندوں میں ان کلام کو سمجھنے والے کتنے ہیں یہ ہنوز ایک
مسئلہ ہے۔ کبیر کی الٹ باسیاں آج بھی اچھے اچھے اسکولرز
کے لئے معمہ بنی ہوئی ہیں۔ نانک اور نکارام کے ارشادات
کو بنا دیا نتی سوجھ بوجھ اور اسکی علامتی اظہاریت کے سمجھنا
محال ہے۔ آج کے عہد میں جب کہ ہر فرد اپنے وجود کی سطح پر
سانس لے رہا ہے۔ ماحول میں اپنے ڈھنگ سے اپنی تلاش

کر رہا ہے۔ شعر سننے ہی کا دی اسے گولی کی طرح
ملک لے سے شاید اب ممکن نہیں۔ اچھا شعر دیے
دیے کھلنے والی کلی کی مانند ہوتا ہے۔ یہ سننے
اور پڑھنے والے سے معیاری سوجھ بوجھ کا تقاضہ
کرتا ہے۔"

"یہ سچ ہے، مشاعرہ میں شعر کی مقبولیت
کوئی معیار نہیں۔ لیکن اچھے شعر کی تعریف یہ بھی
نہیں کہ وہ نا مقبول ہو۔ آرٹ فن کار کے تجربات کا
اظہار ہے۔ ہر ادیب اپنی نظر سے اپنے ماحول کو
دیکھتا ہے اور اس میں دوسروں کو شریک کرنا
چاہتا ہے۔ اسے CONVEY کرنا چاہئے۔ ایسا
کرنے کی کوشش بھی کرنا چاہئے۔ اس کے لیے
شوق، محنت اور لگن کی ضرورت ہے۔ مشاعرہ کی
کامیابی میں شعر کے علاوہ کچھ اور عوامل (Factors)
بھی کام کرتے ہیں۔ کسی خاص وقت کا موڈ اس کے
اعتبار سے موضوع کا انتخاب وغیرہ کئی بار ایسا ہوتا
ہے کہ کوئی کمتر درجہ کی نظم صرف اسلیئے کامیاب
ہو جاتی ہے کہ اس میں کسی سلگتے مسئلہ کو سیدھے
سادے طرح سے بیان کر دیا گیا ہوتا ہے۔ یہ سچ
ہے کہ مشاعرہ کو معیار نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن بقول
اہرنس برگ "وقتی ادب کی بھی ایک خاص عہد
میں بہت اہمیت ہوتی ہے۔"

اہرنس برگ کا یہ قول کئی سال پہلے
آخر شب' میں کیفی کی Agitational شاعری
کے ڈیفنس میں دیا گیا تھا۔ اہرنس برگ نے
اس ایک جملہ کے علاوہ بھی کچھ کہا ہے یا نہیں؟ یہ تو
اہرنس برگ کے مطالعے ہی سے معلوم ہو سکتا
ہے۔ لیکن ضرورت سے زیادہ مادی مصروفیتوں
میں اتنی فرصت کہاں کہ اپنی تخلیقات کے علاوہ کسی
دوسرے کی کتابوں کو پڑھا جائے۔ لیکن یہ حقیقت
ہے کہ لکشمی اور سرسوتی کی برسوں پرانی رقابت
کو ساحر نے جس خوبصورتی سے دوستی میں تبدیل
کیا ہے وہ صرف اردو ہی نہیں عالمی ادب میں
بھی اپنی مثال آپ ہے۔ بقول ساحر کے ہی لفظوں
میں ہر ناشر کو ایک لفظ کا ایک پاؤنڈ ہی ملتا ہے
میں نے تو ایک ایک گیت کے پانچ ہزار سے دس ہزار
لئے ہیں۔

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لیکر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

=○=

ندا فاضلی

فن اور شخصیت کے آپ بیتی سے اخذ

گوالیار کا ایک علاقہ نئی سڑک، دریا کی ریت کو دھو کر چاندی سونا نکالنے والے کولیوں کی کچی کچی جھونپڑیوں کے پیچھے، ستر پچھتر سال پرانے۔ اس کے چھتنار درخت کے سامنے ایک گھر بڑے بڑے دالان، کشادہ صحن، دالانوں کی محرابوں کے اوپر روشندانوں میں خشکی کبوتر کے جوڑے جو آنگن میں اتر کر بے خوف ادھر ادھر گھومتے ہیں اور جہاں سے جو جاتے ہیں منہ میں بھر کر ادھر سے ادھر اڑ جاتے ہیں۔ یہ ذات سید ہیں۔ انہیں ستانا گناہ ہے۔ ان کے پروں کی ہوائیں کئی بیماریوں کو شفا بخشتی ہیں۔ صبح شام دونوں وقت یہ روشندانوں کے کناروں پر بیٹھے ماں اور بڑی بہن کو قرآن کی آیات سناتے ہیں۔

آنگن میں چاروں طرف چھوٹے بڑے پیڑ ہیں ...... یہ سب جاندار ہیں ...... شاخیں اور پتے توڑنے سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ یہ بھی پانچوں وقت خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ سارے پیڑ اور جانور مسلمان سمجھے ہیں گھر میں ایک دو سال کی چھوٹی بڑائی کے کئی بھائی بہن گھر کے ناموں کے علاوہ ہر ایک کا کوئی نہ کوئی چھیڑ خانی کا نام، گھر سے بلا وجہ باہر نکلنے اور کولیوں کے بچوں کے ساتھ کھیلنے پر کڑی پابندی ہے دن بھر گھر میں شور و غل کا عالم۔ بندروں کی طرح چھت، آنگن، دیواریں ناپی جاتی ہیں

«ایک دن»

سورج اک نٹ کھٹ بالک سا
دن بھر شور مچائے
ادھر ادھر چڑیوں کو بکھیرے
کرنوں کو چھترائے
قلم درانتی، برش، ہتھوڑا
جگہ جگہ پھیلائے
شام تھکی ہاری ماں جیسی
ایک دیا ملکائے
دھیمے دھیمے ساری بکھری چیزیں
چنتی جائے۔

گرمی ہو یا سردی سورج اگنے سے پہلے محلے کا کوئی مرغا زور سے اذان دیتا ہے اس اذان کے ساتھ غسل خانے میں نل کی گھڑگھڑاہٹ جاگتی ہے آنگن میں بچھی ہوئی چارپائیوں سے چادریں ہٹائی

جاتی ہیں۔ گہری نیندوں کو پائی چپاکوں سے توڑا جاتا ہے،
گھر کے قریب پرانی مسجد ہے مسجد کے امام صاحب بالکل گھر
کی بغل میں رہتے ہیں۔ دروازہ پر ان کی آواز سے
پہلے تیاری ہو جاتی ہے۔

مسجد میں نماز پڑھنے سے دوگنا ثواب ملتا ہے
سویرے تو آسمان، زمین، پیڑ، پودے، چرند، پرند
سب اللہ اور محمدؐ کی حمد و نعت میں مشغول ہوتے ہیں
مسجد جانے کے لیے جو گھر کا دروازہ کھولتا ہے وہ رزق
کے فرشتے کو گھر میں داخل کرتا ہے۔ ہمیں گھر سے جاتا
دیکھ کر دالان میں پنجرے میں بیٹھا ہوا طوطا بھی باسی
مرچی کو کترتے ہوئے یا نبی یا نبی کا گردان کرتا ہے

گونج رہی ہیں چنچل چکیاں، ناچ رہے ہیں سوپ
آنگن آنگن
چھم چھم
گھونگٹ کاڑھے روپ

دھیمے دھیمے بچھیا کا منہ چاٹ رہی ہے گائے
ہولے ہولے جاگ رہی ہے آڑی ترچھی دھوپ
مکان کے پیچھے ایک لمبی تنگ گلی، جس کے سرے
پر دن بھر گھر گھر چلنے والا کنواں ہے۔ اس کنویں
پر رات کو پریوں کا پہرہ رہتا ہے۔ . . . . .

اور دن بھر لڑکیوں کا ھمگنا ..... سوتی۔ ریشمی
غراروں کی سرسراہٹیں اور پائلوں کی چھما چھم
..... گھر ایک دروازہ گلی کی طرف کھلتا ہے
..... محلے کے سارے مکان برابر برابر ہیں۔ جب
حرارتیں جسارتوں کا روپ دھارتی ہیں تو آن کی
آن میں شور بچ جاتا ہے۔ شکایتیں گھر تک آتی ہیں
..... لڑکیاں حرافائیں ہیں جو لڑکوں کو مفت بدنام
کرتی ہیں ان کے لباس بھی ایسے ہوتے ہیں کہ فرشتے
بھی شرم سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ پڑھے لکھے لڑکے
ان پڑھ گنواروں کو بھلا منہ کیسے لگا سکتے ہیں.....
ہر بار قصور لڑکوں کا ہوتا ہے..... لیکن یہ بے
قصور لڑکیاں بہت قیمتی ہوتی ہیں۔ یہ جلتی بھرتی
دولتیں ہیں۔ جو صرف دیکھنے سے ساری فضاؤں کو
زیر کر دیتی ہیں۔

آمنے سامنے دو نئی کھڑکیاں
جلتی سگریٹ کی لہراتی آواز میں
سوئی ڈوری کے رنگین الفاظ میں
مشورہ کر رہی ہیں
کئی روز سے
شاید اب بوڑھے دروازے

سر جوڑ کر
وقت کی بات کو وقت پر جان لیں
بیچ کی ٹوٹی پھوٹی گلی چھوڑ کر
کھڑکیوں کے اشاروں کو پہچان لیں

سنہ ۱۹۶۴ء سنہ ۱۹۶۵ء کا زمانہ شہر میں جگہ جگہ ہندو مہا سبھا کی سبھائیں ہو رہی ہیں باڑے (گوالیا کا بازار) پر عام مجمع میں قرآن کو جلا کر عوام میں خوف ہراس پھیلایا جاتا ہے ماں میرے کالج کے دوست بیر کمار سے ملنے جلنے پر پابندی لگاتی ہے۔ بیر کمار کی بھابی میرے پینے کا گلاس الگ کر دیتی ہے.....

ہمارے گھر کے پچھواڑے حلوائی کی دوکان سے لگا ایک غریب رنگ ریز کا گھر دن دھاڑے لوٹ لیا جاتا ہے۔ میں زندگی میں پہلا قتل ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں اور دنوں بیمار رہتا ہوں۔

..... پاکستان اچانک ہر گھر کی جنت بن گیا ہے وہاں ہر آدمی عیش کرتا ہے۔ جن کو یہاں .... جھونپڑیاں میسر نہیں تھیں وہاں بڑی بڑی عمارتوں کے مالک ہیں۔ اسلامی ملک ہے خدا وہاں اپنے محبوب کی امت پر رحمتوں کی بارش کر رہا ہے

بھور بھئی .....

بستی کے اندر گھس آیا ویرانہ
دھرتی پہ ریکھائیں جھلیں
کھڑی ہوئی دیواریں
سرحد سرحد جگے سپاہی
چمک اٹھیں تلواریں
کوئی لڑے بیوی بچوں سے
کوئی لکھے افسانہ
بجھے آنگن۔ گھر، دریچے
ٹکڑا ٹکڑا دھوپ
دو پیروں پر چلتے بندر
انسانوں سے روپ
چپ چپ دیکھے کھیل سیانا
شور کرے دیوانہ
بھور بھئی بستی کے اندر
گھس آیا ویرانہ

مجھے کالج سے بھوپال ریڈیو کے طالب علموں کے مشاعرہ میں بلایا جاتا ہے۔ اخباروں میں گوالیار کے فسادات کی خبریں چھپتی ہیں۔ وہ والد کے دوست مجھے فوراً آجانے سے روک دیتے ہیں۔ ایک ہفتہ بعد واپس لوٹتا ہوں لیکن گھر اپنی جگہ نہیں ملتا ہے گیلا

ہوں بے گھر ہوں
کمیونسٹ پارٹی نے رہنے کے لئے ایک کمرہ دیدیا ہے
کمیونسٹ پارٹی سے قریب بھی ہوں اور زندہ رہنے کے
لیے پارٹی کی میٹنگس کی سی۔آئی۔ڈی انسپکٹر کو دے کر
روٹی کما رہا ہوں۔ چھوٹا شہر ہے۔ روکھی سوکھی روٹی
کمانے کے جرم میں مجھ سے چھت اور دیواریں چھین لیتے ہیں
ایک دوست کے یہاں سوتا ہوں۔

پھیلی دھرتی
کھلا آکاش تھا میں
چاند، سورج، کہکشاں، کہسار، بادل
لہراتی، وادیاں، خاموش، جنگل
میں ہی میں
پھیلا ہوا تھا ہر دشا میں
جیسے جیسے
آگے بڑھتا جا رہا ہوں
ٹوٹتا مڑتا، سکڑتا جا رہا ہوں
کل زمیں سے آسماں تک
میں ہی میں تھا
آج
اک چھوٹا سا کمرہ رہ گیا ہوں

کالج میں ایم۔اے کا فائنل ایر ہے میں یہ
چاہتا ہوں اسے پورا کرلوں۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے
اچھے گھر کا ایک دوست کبھی کبھار کچھ پیسے دے جاتا ہے
ہر ہفتہ میں دو تین دن ہندوستانی صرف پانی پر اکتفا
کرتا ہے۔ متوسط طبقے کے کمپلیکس کھل کر ضرورتوں کا
اظہار نہیں کرنے دیتے۔ کوئی مدد کرتا ہے تو اچھا نہیں
لگتا، کوئی بے رخی برتتا ہے تو برا لگتا ہے

بند کمرے
چیپناتا گھپ اندھیرا
اور دیواروں سے ٹکراتا ہوا میں
منتظر ہوں مدتوں سے اپنی پیدائش کے دن کا
اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا ہوں جب سے
میں
خود اپنے پیٹ کے اندر پڑا ہوں

تنہا زندگی گزر رہی ہے۔ کوئی روک ٹوک
نہیں ہے۔ ہر چیز بدلی بدلی نظر آ رہی ہے۔ ہوٹل
کے بھاؤ اور صابن کے دام کے ذریعہ سماج سے نئی
سطح پر رشتہ قائم ہوتا ہے۔ پیٹ کے ایندھن کی
تلاش، سیاست سے متعارف کراتی ہے۔ مسلمان
میں سے مسلمان اور ہندو سے ہندو غائب ہو جاتا ہے

سب ایک طرح کی بھیڑیں بن جاتے ہیں۔ جنہیں ہر پانچ
سال کے بعد نئے نئے چرواہے جدھر چاہتے ہیں ہنکا کر
لے جاتے ہیں۔ کتابوں کے لفظ چھوٹے ہو جاتے ہیں
عقیدتیں اپنا وقار کھونے لگتی ہیں۔ سارے بھید بھاؤ
مٹ جاتے ہیں۔ صرف دو ذاتیں رہ جاتی ہیں

امیر اور غریب۔

مسجد کا گنبد سونا ہے
مندر کی گھنٹی خاموش

جزدانوں میں لپٹے سارے آدرشوں کو
دیمک کب کی چاٹ چکی ہے

رنگ

گلابی

نیلے

پیلے

کہیں نہیں ہیں
تم اس جانب
میں اس جانب
بیچ میں میلوں گہرا غار
لفظوں کا پل ٹوٹ چکا ہے
تم بھی تنہا

میں بھی تنہا

گرلس ہارنس کالج میں نظمیں پڑھنے کیلئے
بلایا جاتا ہے آٹو گراف لیے والیوں میں ایک لڑکی
انجانی ہوتے ہوئے بھی جانی پہچانی سی لگتی ہے
ہونٹوں کی خاموش مسکراہٹ لفظ بنتی ہے اور لفظ
بات میں ڈھل جاتا ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے اس
کے گھر والوں کو اس کے لئے انگریزی کے ٹیوٹر
کی ضرورت ہے۔ اور مجھے اس کے زیادہ قریب
ہونے کی وحشت ہے۔ عشق نے حالات سے بے خبر
کر دیا ہے۔ اس کے بدن کی خوشبو اپنے بدن سے
آنے لگتی ہے۔ شہر اچانک اپنا لگنے لگتا ہے۔ راستوں
کی خاموش موڑ اور گھاس، پھول باتیں کرنے لگتے ہیں

بہت سے کام ہیں
لپٹی ہوئی دھرتی کو پھیلا دیں
درختوں کو اگائیں ڈالیوں پر پھول مہکا دیں
پہاڑوں کو قرینے سے لگائیں۔ چاند لٹکائیں
خلاؤں کے سروں پر نیلگوں آکاش پھیلائیں
ستاروں کو کریں روشن ہواؤں کو گتی دیدیں
پھدکتے پتھروں کو پنکھ دے کر نغمگی دیدیں
لبوں کو مسکراہٹ، انکھڑیوں کو روشنی دیدیں

سڑک پر دُولتی پرچھائیوں زندگی دے دیں

خدا خاموش ہے

تم آؤ تو تخلیق ہو دنیا

میں اتنے سارے کاموں کو اکیلا کر نہیں سکتا

لڑکی کے گھر والے ناراض ہیں ان کی ناراضگی

جائز ہے۔ میرے پاس نہ رہنے کو گھر ہے نہ زندہ

رہنے کے لئے کوئی کام۔ صرف شاعری سے گھر

بار کہاں بستا ہے۔ میں گوالیار چھوڑ رہا ہوں لڑکی

ہر قیمت پر میرے ساتھ چلنے کے لئے بضد ہے وہ

پیسے لے کر آئی ہے۔ میں اس کے بجائے اسکے

پیسوں کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ محبت کے

دیوتا کیوپڈ کو لوگ بلا وجہ اندھا بنائے ہوئے ہیں لڑکیوں

کے والدین ظالم ہوتے ہیں وہ محبت کو روٹی کپڑے کے

میزان میں تولتے ہیں۔ لڑکیاں بھی بے وفا ہوتی ہیں

وہ سمجھ آنے پر والدین کی طرح سوچتی ہیں۔

ممکن ہے — چند روز پریشان رہی ہو تم

یہ بھی ہوا ہو وقت پہ سورج اگا نہ ہو

الٹی میں کوئی اچھا کنارا لگا نہ ہو

چھت کی کھلی ہوا میں دوپٹہ اڑا نہ ہو

دو تین رضائی میں سردی رکی نہ ہو

کمرے کی رات پنکھا بیمار ہے اڑی نہ ہو

ہنسنے کی بات پہ کبھی مشکل ہنسی ہو تم

ممکن ہے چند روز پریشان رہی ہو تم

کچھ دن خطوں میں آنسو بہے شور و غل ہوا

تم زہر کے سوئیں میں الجھن سے کٹ گیا

پھر یوں ہوا

کہ دھوپ کھلی ابر چھٹ گیا

میں نے وطن سے کوسوں پرے گھر بسا لیا

تم نے پڑوس میں نیا بھائی بنا لیا

دلی میں بھٹکاؤ۔ ایک قریبی رشتہ دار کے

یہاں ٹھہرتا ہوں۔ وہ دوسرے دن میرے سامان

کو ایک شکستہ مسجد کے حجرے میں ڈال دیتا ہے کئی

جگہ ہاتھ پیر مارتا ہوں مگر کہیں کامیابی نصیب

نہیں ہوتی۔ تنگ آ کر بمبئی کی طرف نکل آتا ہوں

کئی کام کرتا ہوں۔ اخباروں میں کالم نویسی۔ ناکام

فلموں میں مکالمے۔ ہندی اردو رسالوں کی

ایڈیٹری، مگر حالات میں نمایاں تبدیلی نہیں ہوتی ہے

اپنے مزاج کی وجہ بے اثر لوگوں کو دوست اور

با اثر شخصیتوں کو مخالف بناتا ہوں اور خود ہی پریشان

ہوتا ہوں۔ ساحر لدھیانوی ایک مشاعرہ میں ملتے ہیں

ان کی وہاں گالم گلوچ سے کرشن چندر کو دورہ
پڑ جاتا ہے۔ ان کی شرط ہے مشاعرہ میں میں ہوں گا
یا وہ...... بازی ان کے ہاتھ رہی ہے۔ عصمت
چغتائی کے لفظوں میں A-1 - C کا ایجنٹ ہوں
ترقی پسندوں کا میرا مخالف ہونا جائز سمجھا جاتا ہے
مشاعرے بند ہو جاتے ہیں۔ کام ملنے میں رکاوٹیں
پیدا کی جاتی ہیں ——— سی۔ آئی۔ اے
A-1 - C کا ایجنٹ امریکہ کے افلاس کا شکار
ہو جاتا ہے۔

یہ کیسی بستی ہے
میں کس طرف چلا آیا
فضا گونج رہی ہیں ہزاروں آوازیں
سلگ رہی ہیں ہواؤں میں ان گنت سانسیں
جدھر بھی دیکھو کھڑے کو ملے پنڈلیاں ٹانگیں
مگر کہیں کوئی چہرہ نظر نہیں آتا
یہاں تو سب ہی بڑے چھوٹے اپنے چہروں کو
چمکتی آنکھوں کو گالوں کو ہنستے ہونٹوں کو
سروں کے خول سے باہر نکال لیتے ہیں
سویرا ہوتے ہی جیبوں میں ڈال لیتے ہیں
عجب بستی ہے اس میں نہ دن نہ رات نہ شام

بسوں کی بھیڑ سے سورج طلوع ہوتا ہے
جھلستی ٹین کی کھولی میں چاند سوتا ہے
یہاں تو کچھ بھی نہیں
ریل اور بسوں کے سوا
زمیں پہ رینگتے بے حس سمندروں کے سوا
عمارتوں کو نگلتی عمارتوں کے سوا
یہ قبر قبر جزیرہ کہ جگاؤ گے
خود اپنے آپ سے الجھو گے ٹوٹ جاؤ گے

ابھی تک بمبئی میں ہوں۔ آنکھوں روشنیاں
اتنی بس گئی ہیں کہ دوسری ہر بستی اندھیری محسوس
ہوتی ہے۔ حالانکہ زیادہ دنوں تک رہنے سے روشن
سے روشن شہر بھی بجھنے لگتا ہے۔ بمبئی میں رہنے کے لئے
بمبئی کے آداب سے سمجھوتہ ضروری ہے۔

جب سے قریب ہو کے چلے زندگی سے ہم
خود اپنے آئینے کو لگے اجنبی سے ہم
کچھ دور چل کے راستے سب ایک سے لگے
ملنے گئے کسی سے مل آئے کسی سے ہم
شائستہ محفلوں کی فضاؤں میں زہر تھا
زندہ بچے ہیں ذہن کی آوارگی سے ہم
اچھے بُرے کے فرق نے بستی اجاڑ دی
مجبور ہو کے ملنے لگے ہر کسی سے ہم

جنگل میں دور تک کوئی دشمن کوئی دوست

مانوس ہو چلے ہیں مگر بمبئی سے ہم

ہندو پاک کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ ماں کراچی میں سخت بیمار ہے۔ میں ہندوستان کا وفادار ہوں۔ دشمن ملک سے دشمنی کرنا میری ہندوستانیت کی پہچان ہے پاکستان سے تار آیا ہے کراچی کے ایک محلے ناظم آباد میں ہندوستان کی بہبودی کیلئے اٹھنے والے دعاؤں کے ہاتھ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے ہیں۔ اب بنا دعاؤں کے آسمان کے نیچے آخری وقت میں ماں سے دودھ بخشوانے کا عذاب سہہ رہا ہوں

کراچی ایک ماں ہے.

بمبئی بچھڑا ہوا بیٹا

یہ رشتہ پیار کا پاکیزہ رشتہ ہے

جسے اب تک

نہ کوئی توڑ پایا ہے

نہ کوئی توڑ سکتا ہے

غلط ہے ریڈیو۔ جھوٹی ہیں سب اخبار کی خبریں

مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی

کی

پیش کش

ترکش

گوالیار کے کہنہ مشق شاعر

شکیل گوالیاری کا شعری مجموعہ

نہ میری ماں کبھی تلوار تانے رن میں آئی ہے

نہ میں نے اپنی ماں کے سامنے بندوق اٹھائی ہے

یہ کیسا شور ہنگامہ ہے

یہ کس کی لڑائی ہے ! ○

ندا فاضلی

قسط ۱۱ شاعر سے اخذ

دیواروں کے بیچ

سورج غروب ہو رہا ہے ایک بے ہوش عورت کے گرد تین چار بچے سہمے ڈرے بیٹھے ہیں بڑی بہن اٹھ کر لالٹین کی چمنی صاف کر کے اسے روشن کرتی ہے۔ چاروں طرف جیسے کبری روشنی پھیل جاتی ہے۔ سامنے املی کے درخت پر ایک ڈراونا بھوت روز کی طرح آج بھی آکر بیٹھ گیا ہے لمبے لمبے دانت ٹیڑھے میڑھے ہاتھ پیر۔ ہوا سے شاخیں ہلتی ہیں تو اس کی گرم سانسیں بہت قریب محسوس ہوتی ہیں۔ دالان سے آنگن میں آتے بھی ڈر لگتا ہے

بڑی بہن بھوت دفع کرنے کے لئے اندر سے قرآن شریف لا کر باہر اسٹول پر رکھ دیتی ہے بچوں اور بھوت کے درمیان اللہ کے کلام کی حد بن جاتی ہے بھوت میں اس حد تک کو پھلانگ مارنے کی ہمت نہیں ہے۔ لیکن جب بھی نظر اٹھتی ہے وہ املی کی شاخوں سے جھانکتا نظر آتا ہے۔

یہ بھوت قرآن کی حد میں داخل تو نہیں ہوتا لیکن اپنی موجودگی کا احساس پھر بھی رہتا ہے۔ اس خوف سے بھوک پیاس سب غائب ہو جاتی ہے بھوت صرف مرتضی حسن کے قدموں سے ڈرتا ہے جیسے ہی گلی میں ان کے قدموں کی آہٹ دھلتی ہے یہ آپ ہی سمٹ کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ لیکن مرتضی حسن کے آنے تک آدھی سے زیادہ رات گزر چکی ہوتی ہے۔ اور آدھی رات تک غنودہ پلکوں سے آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے۔

بے ہوش عورت جو اُن بچوں کی ماں ہے ہوش میں آتی ہے۔ ارگرد بیٹھے ہوئے اُن بچوں کو دیکھتی ہے۔ اور منھ ہی منھ میں کچھ پڑھ کر انگلی سے چاروں طرف حصار کھینچتی ہے۔ مرتضی آتے ہی اپنی شیروانی کھونٹی پر ٹانگ کر بستر پر دراز ہو جاتے

......

صبح کے دھندلکوں سے گوالیار کا ایک محلہ دھیمے دھیمے ابھر رہا ہے۔ نئی سڑک، بڑے دالان اور آنگن اور کئی کشادہ کمروں کا ایک اونچی دیواروں کا پرانا گھر۔ اس گھر میں دائیں بائیں کئی دروازے ہیں سامنے املی کا گھنا درخت ہے۔ جس میں بارہ مہینے کھٹے کتارے

جھولتے ہیں۔ اُن کو پوری دوپہر محلے بھر کے بچے
پتھر مار مار کر گراتے ہیں۔ ان کتاروں کی چھینا جھپٹی
میں ہر روز کئی چھوٹی بڑی لڑائیاں ہوتی ہیں۔ اِن
لڑائیوں میں کبھی بڑی عورتیں بھی شریک ہو جاتی ہیں
عورتیں آپس میں الجھ کر کئی دن ایک دوسرے سے نہیں
بولتیں۔ لیکن بچے تھوڑی دیر میں ہی پچھلی باتوں کو بھول کر
ایک ہو جاتے۔

اس ویلی کے پیڑ کا ایک بڑا بھائی بھی ہے گھر
کے بائیں دروازے کے سامنے لمبے چوڑے پیٹ
اور کئی موٹے بھاری ہاتھوں والا نیم کا درخت
...... یہ دونوں عمر کے لحاظ سے بزرگ ہیں انکی
عمروں کا اب کوئی اس محلے میں نہیں ہے۔ دوپہر
بھر یہ دونوں چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں اور
شام ہوتے ہی سنجیدہ ہو کر ہر آنے جانے والے پر
نظر رکھتے ہیں اور چوکیداری کرتے ہیں۔ اس چوکیداری
میں جنگلی کتے بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ کتے اتنے
دنوں سے اس محلے میں ہیں کہ ہر ایک کو بنا نام کے
پہچانتے ہیں۔ رات کے وقت جیسے ہی کوئی اجنبی
اس علاقے میں داخل ہوتا ہے یہ چلا چلا کر طوفاں
سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ ان کو چپ کرنے کے لئے داخلہ
کا کارڈ دکھانا پڑتا ہے۔ اور یہ کارڈ ہوتا ہے محلے ہی کا
کوئی آدمی ......

مکان کے پیچھے ایک تنگ سی گلی ہے اس
گلی کے کونے پر ایک پرانا کنواں ہے۔ جس پر ہمیشہ
پانی بھرنے والی لڑکیوں کا جمگھٹا رہتا ہے یہ کنواں
ساری لڑکیوں کا ہمراز ہے۔ یہ کسی کی بات دوسرے
سے نہیں کہتا۔ مگر ہے بہت مزاقیہ۔ دن بھر اس
کی باتوں پر لڑکیاں قہقہے لگاتی رہتی ہیں

آس پاس کئی کچے پکے چھپر کے گھر ہیں۔ ان
میں کولی ذات کے لوگ رہتے ہیں۔ سویرا ہوتے
ہی یہ گروہ بنا کر تنگبرا ندی کے کنارے نکل جاتے ہیں
اور شام کو وہاں سے ریت بھر کر لاتے ہیں۔ جسے بھٹی
میں تپا کر دن بھر سونا چاندی نکالتے ہیں۔ سنا ہے
قارون بادشاہ کا خزانہ غرقاب ہو گیا تھا۔ جو سورج کی
شعاعوں میں آج بھی ریت کے ذروں میں جھلملاتا ہے
یہ لوگ شاید ریت سے اسی دولت کو برآمد کرتے ہیں
رات کو کچی شراب کے نشے میں دیر تک ناچتے گاتے ہیں
جب تھک جاتے ہیں تو اپنی عورتوں سے لڑ جھگڑ کر تازہ
دم ہو جاتے ہیں۔ عورتیں گھر کے مردوں کی ملکیت ہیں
یہ کبھی بیوہ نہیں ہوتیں۔ پری وار کے آخری مرد تک

ان کی مانگ بھری رہتی ہے جب کوئی لڑکی یا عورت اس رسم کے خلاف آواز اٹھاتی ہے تو دو چار دن مار کھا کر دوسروں کی طرح بن جاتی ہے۔ ان کولیوں کی عورتیں اور لڑکیاں سویرا ہوتے ہی پیتل کے گھڑے لے کر اس اونچی دیواروں کے پرانے گھر میں پانی بھرنے آتی ہیں۔ پورے محلے میں اسی ایک گھر میں نل ہے۔

وہ پانی بھرتی رہتی ہیں اور گھر کے شریر بچے کچی عمروں کی گداز پنڈلیوں اور سینوں کے ابھاروں کا نظارہ کرتے رہتے ہیں۔ بائیں دروازے سے کچھ دور ایک چھوٹے سے کھپریلوں کے کچے گھر میں مسجد کے پیش امام رہتے ہیں۔ انھیں سب ملاجی کہتے ہیں۔ پولیس سے سپاہی کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ بڑے رعب کے آدمی ہیں۔ نوکری سے آزاد ہونے کے بعد بھی پولیس کی خاکی وردی اور فل بوٹ پہنتے ہیں۔ جو اب اپنا رنگ روپ کھو چکے ہیں۔ جوتے کا چمڑا جگہ جگہ سے چیخ کر بہروپ سے بڑا ہو چکا ہے۔ اور وردی خاکی سے کتھئی ہونے لگی ہے۔ مسجد میں نماز پڑھاتے ہیں۔ اور پانچوں وقت اذان دیتے ہیں۔ یہی اب ان کا ذریعہ معاش ہے۔

ان کو کبھی کسی نے مسکراتے نہیں دیکھا۔ ممکن ہے کبھی مسکرائے بھی ہوں۔ لیکن چہرہ پر داڑھی اور مونچھوں کا گھنا ؤ اس مسکراہٹ کو باہر نہیں آنے دیتا۔ ان کی بیوی چہرے مہرے سے پہاڑی علاقے کی لگتی ہے۔ ہاتھ پاؤں گدے ہوئے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے ملاجی کے یہاں آنے سے پہلے وہ ہندو تھیں۔۔۔۔ پہاڑوں سے برسوں کے دور ہیں لیکن اب بھی منہ اندھیرے چکی پیستے وقت بہت دور کسی گھاٹی میں نکل جاتی ہیں اور دیر تک پہاڑی بولی میں گیت گاتی رہتی ہیں۔ ملاجی ہر روز منہ اندھیرے اللہ اکبر کا ورد کرتے مسجد کے لیے نکلتے ہیں۔ ان کی آواز سنتے ہی محلے کے اس بڑے گھر کا پھاٹک کھلتا ہے اور دو بچے نیند بھری آنکھوں کے ساتھ آدھے جاگے ہوئے آدھے سوئے ہوئے ان کے ساتھ ہو لیتے ہیں ان میں ایک نام مصطفےٰ حسن اور دوسرے کا مقصد حسن یہ چھوٹے بڑے بھائی ہیں۔

ابھی مسودک پرتا گئے نہیں آئے۔ ہر طرف خاموشی ہے۔ حاجی جی حسب معمول ہاتھ میں تسبیح لے اپنی حویلی کی دہلیز پر بیٹھے ہیں۔ یہ دو بار حج کر کے آئے ہیں۔ حویلی کے ہیجڑوں کے مرغنہ ہیں محلے میں ہر بچہ

کی پیدائش پر یہ گرسے اور نچی چولی اور رنگین سلھی پہنے اپنے چیلوں کے ساتھ آتے ہیں اور دیر تک ڈھولک کی دھاپ پر کسی ہوئی بھاری آواز میں گا بجا کر پیسے اور کپڑے وصول کرتے ہیں۔ جاتے وقت بچہ اور زچہ دونوں کے لئے ڈھیر ساری دعائیں دیتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر بچوں کے ہاتھ آپ ہی آپ ماتھے پر اٹھ جاتے ہیں۔ یہ مسکراتے ہوئے جگ جگ جیو کہتے ہیں۔ اور پھر وظیفے میں ڈوب جاتے ہیں۔

رستے کے بیچ ایک چوڑی سی پانی کی ناند ہے پنڈت جگت رام گلے میں جنیو ڈالے منہ اندھیرے ہی ایک لکڑی میں دو بالٹی ٹانگے اسے بھرنا شروع کر دیتے ہیں اس ناند سے سارے دن پیاسی گائیں، گھوڑے اور بیل پانی پیتے ہیں۔ پنڈت جی کسی دفتر میں چپراسی ہیں۔ یہ ناند ان کے پرکھوں میں سے کسی نے کسی منت کے پورے ہونے پر بنوائی تھی:۔ اس روایت کو یہ اب تک دھرم کی طرح نبھاتے ہیں۔ اس کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت بھی اپنی جیب ہی سے کرتے ہیں۔ اس ناند کے ذریعہ وہ اپنے پرکھوں سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔

پنڈت جی ان بچوں کا سمبندھ صرف سویرے کی مسکراہٹ تک محدود ہے۔ وہ رام رام کے جاپ میں محو، پانی بھرتے رہتے ہیں۔ لیکن بچوں کو دیکھتے ہی گردن ہلا کر مسکرا دیتے ہیں۔ یہ بچوں کو چہروں سے جانتے ہیں۔ اور بچے انھیں مسکراہٹ سے پہچانتے ہیں..... سڑک کے فٹ پاتھ پر دو چار لوگ جوار کے دانے ڈال کر ڈھیر سارے جنگلی کبوتر جمع کئے ہوئے ہیں۔ کبوتر دانے چگ رہے ہیں یہ ٹھیک وقت پر ادھر ادھر پیڑوں میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور جیسے ہی جوار زمیں پر بکھرتی ہے یہ زمین پر اتر آتے ہیں۔ کبوتر سید ہوتے ہیں یہ سبز گنبد کا طواف کرنے والوں کے رشتہ دار ہیں ان کے پروں کی ہوا میں کئی بیماریوں کا علاج ہے جبھی طلوائی کی ان کبوتروں سے دوستی بہت پرانی ہے ان کے دیکھا دیکھی اب اور بھی جوار لیکر آنے لگے ہیں ان کبوتروں کے پاس ہی بھٹی کے قریب اونگھتا ہوا کتا ٹانگیں پھیلا کر انگڑائی لیتا ہے۔ اور کبوتروں میں تھوڑی سی ہلچل ہوتی ہے کچھ ڈر کر اڑ بھی جاتے ہیں لیکن اُڑنے والے کبوتر شاید نئے ہوتے ہیں۔ جو روز کے آنے والے ہیں وہ تو کتے کی ٹانگوں کے پاس سے بھی دانے چگتے ہیں اور جھجک محسوس نہیں کرتے۔ کبوتر کتے سے واقف ہیں اور کتا

کبوتروں کو بچاتا ہے۔ چینی حلوائی ان دونوں بچوں کے چاچا ہیں۔ نماز سے لوٹتے وقت ان کو سلام کرکے آگے بڑھنا ان کا فرض ہے۔ یہ دونوں بھائی (جن میں بڑے کی عمر آٹھ سال ہے اور چھوٹا جو کافی دبلا پتلا ہے اپنے بھائی سے دو سال چھوٹا ہے) مرتضیٰ احسن کے لڑکے ہیں۔ جو سندیلا اسٹیٹ ریلوے میں ایک بڑے افسر ہیں۔ اچھی خاصی تنخواہ ہے اس علاوہ اوپر کی آمدنی کی بھی ریل پیل ہے شاعر بھی ہیں۔ داغ کے جانشین، نوح ناروی کے ممتاز شاگرد ہیں۔ دو شعری مجموعے "تصویر دعاؔ" اور "تاثیر دعاؔ" ۱۹۳۸ء کے مصنف ہیں۔

شعر ایسے ہے ؎

میری جاں مانگی تو کیا تم نے مانگی میری جاں کا کیا مری جاں ہوگا
یہ خود بھی پریشان ہے زندگی سے اسے جو بھی لیگا پریشان ہوگا
شان کے لوگ کم رہ گئے ۔۔ ایک تم ایک ہم رہ گئے

علی گڑھ کے پاس ایک چھوٹے سے ڈبائی نامی قصبے کے رہنے والے ہیں۔ اسی رعایت سے اپنے تخلص دعا کے ساتھ ڈبائیوی لگاتے ہیں۔ کافی مذہبی مزاج ہیں۔ مجرے، مشاعرے اور نئے نئے عشق پر دانے شوق ہیں۔ گویا یار میں اپنے بہن بھائیوں سے دور تنہا رہے ہیں۔ ان تنہائیوں کو جوانی کے ہاتھوں خوب تقسیم کیا۔ کئی طوائفوں سے شناسائیاں ہیں ایک سے تو سنتے ہیں دو لڑکے بھی ہیں۔ لیکن ان کے ناموں میں ان کا نام شامل نہیں ہے

گھر میں اچھی شکل و صورت کی بیوی ہے اور ساتھ میں سندیلا دربار کی ایک مغنیہ کی زلف کے اسیر بھی ہیں۔ اس مغنیہ کا نام زیب النساء ہے ریڈیو سے بھی کلاسیکی میوزک کے پروگرام دیتی ہیں بچہ کوئی نہیں۔ مرتضیٰ حسن کے بچوں کو جہاں دیکھ لیتی ہیں ٹوٹ کے پیار کرتی ہیں۔ بلائیں لیتی ہیں پیسے دیتی ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود بچوں کو وہ پسند نہیں۔

بیوی کا نام جمیل فاطمہ ہے دہلی کے ایک سید گھرانے سے ہیں مزاج مذہبی ہے۔ شعر و شاعری کا ذوق رکھتی ہیں اور خواتین نشستوں میں سناتی ہیں۔ شعر کہنے کا جب موڈ ہوتا ہے تو جھاڑو دے رہی ہوں یا روٹی پکا رہی ہوں کاغذ پنسل ساتھ ہی ہوتے ہیں فکر سخن کی محویت کبھی روٹی جلا دیتی ہے۔ کبھی سالن میں نمک کا توازن بگاڑ دیتی ہے۔ ماہنامہ عصمت یا رہنمائے تعلیم میں مخفی کے تخلص سے شائع بھی ہوئی ہیں۔

مرتضیٰ حسن عمر کے پینتیس۳۵ سال گزار چکے ہیں گھر

والوں سے دور گوا لیار میں بنا روک ٹوک جیسے چاہا جئے۔ آشنائیاں کئی ہوئیں۔ لیکن کسی نے شادی کا روپ نہیں لیا۔ تفریح کی آزادی ہے۔ لیکن شادی کیلئے ذات برادری کی اخلاقی پابندی ضروری ہے۔ دہائی میں ان کے دو بڑے بھائی اور ایک بہن ہیں دہلی کے ایک برادری کے گھر میں امتہ الحبیب کی چھوٹی لڑکی کے لئے پیام بھیجا جاتا ہے لڑکی ماں بیوہ ہے گھر میں ایک کم عمر بھائی خلیل احمد کے علاوہ دوسرا مرد نہیں ہے۔ بڑی بہن شادی شدہ ہے وہ اور ان کے شوہر ریلوے کے افسری اور مشترکہ برادری کو کافی سمجھتے ہیں۔ آگے لڑکی کی قسمت اور خدا کی حکمت...... زیادہ چھان بین کے بنا رشتہ منظور ہو جاتا ہے۔ اور جمیل فاطمہ دس سال کے فرق کے باوجود مرتضیٰ حسن کے حوالہ کر دیجاتی ہے لیکن برسوں کی آزاد مزاجی کو ازدواجی زندگی میں ڈھلنے میں کافی وقت لگتا ہے۔

جمیل فاطمہ جس معاشرے سے آئی ہیں اس میں عورت اور مرد کا رشتہ آسمان پر طے ہو کر زمین پر اترتا ہے۔ اس رشتے کے فرائض کے ساتھ کچھ حقوق بھی ہیں۔ لیکن یہاں کے زمین آسمان ہی مختلف ہیں شوہر اپنی مرضی کا مختار ہے۔ عورت گھر کی زینت ہے ہونے والے بچوں کی ماں ہے اسے شوہر کے معمولات میں شرکت کی آزادی نہیں ہے۔

مرتضیٰ حسن کی گھر سے باہر کی زندگی اُن کی اپنی ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی کے وہ تیار نہیں ہیں۔ صبح آفس کے لئے نکلتے ہیں اور پھر آدھی رات تک لوٹتے ہیں۔

جمیلہ فاطمہ جمائیں جمائیں کرتے گھر میں اکیلی ایک نوکرانی کے ساتھ وقت گزارتی ہیں دور دور تک کوئی رشتہ داریاں نہیں ہیں۔ محلے کی عورتیں شوہر کو بس میں کرنے کی نئی نئی ترکیب بتاتی ہیں کہیں سے اچھی خاصی رقم دے کر تعویذ منگایا جاتا ہے کوئی رات کو دیر تک پڑھنے والا وظیفہ بتاتا ہے۔ کبھی کسی کے ساتھ مقامی بزرگ کی درگاہ پر حاضری دے کر منت مانگتی ہیں ہر دوسرے تیسرے دن مراد کا روزہ رکھتی ہیں

جس مقصد کے لئے شادی کی گئی تھی وہ بھی پورا ہوتا ہے۔ دو سال کی مدت میں مرتضیٰ حسن دو بچوں کے باپ بن جاتے ہیں۔ لڑکی بڑی ہے اس کا نام قمر طلعت ہے۔ لڑکے نام مصطفےٰ حسن رکھا جاتا ہے ان بچوں

کے باوجود زندگی کا دھرا ویسا ہی ہے جیسا کہ پہلے تھا
منتیں اور دعائیں بھی جاری ہیں۔ لیکن ان منتوں
اور دعاؤں کو قبول کرنے والے خدا اور درگاہوں
کے بزرگوں کو اور بھی دوسرے کام ہیں ان کی باری
آنے میں اتنی دیر لگتی ہے۔ کہ وہ اپنے اندر چپ چاپ
گھٹتی ہوئی اختلاج کے مرض کا شکار ہو جاتی ہیں بیہوشی
کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے ہاتھ پاؤں کانپتے
ہیں اور غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ شروع میں
محلے کی بڑی بوڑھیاں آتی ہیں۔ نہیں ہوش میں
لانے کی کوششیں کرتی ہیں۔ بچوں کو ڈھارس
بندھاتی ہیں۔ لیکن جب یہ ہر روز کا معمول بن جاتا ہے
تو ہمدردیاں کم ہونے لگتی ہیں

اب ان بچوں اور ماں کے درمیان پہاڑ سی
ڈراؤنی رات ہے اور ابّی کا بھوت ہے۔

ہر بچے کی پیدائش دہلی میں ہوتی ہے وہ
اب تیسرے بچے کی ماں بننے والی ہیں دو کے بعد
تیسرا بچہ ایسی حالت میں مناسب نہیں ہے لیکن کیا کیا
جائے۔ تین مہینے پورے ہو چکے ہیں...... ایسے کام
چھپ چھپا کر ہی کیے جاتے ہیں۔ سنی سنائی جڑی بوٹیوں
سے ہی خدا کے کام میں دخل اندازی کیجاتی ہے

کئی گرم سرد دوائیں استعمال ہوتی ہیں ابھی یہ
سلسلہ جاری ہے کہ اچانک ایک دن دہلی
میں ان کے بھاری پاؤں تلے موروثی مکان کی
چھت کھسک جاتی ہے ہوتا یوں ہے کہ وہ صبح
غسل خانے سے باہر آتی ہیں لیکن جیسے ہی پاؤں
بڑھاتی ہیں دھنسنے لگتی ہے۔ وہ ٹوٹتی چھت
سے سیدھی نیچے فرش پر گرنے کو ہوتی ہیں کہ
ان کے ہاتھ میں ایک لوہے کا سریا آجاتا ہے
اتفاق سے ان کے بھائی اس وقت نیچے ہی
مکان کی مرمت کرا رہے تھے۔ پتھروں کے گرنے
کی آواز سے چونک کر اوپر دیکھتے ہیں اور اپنی بہن کو
زمین و آسمان کے درمیان معلق پاتے ہیں وہ بانہیں
پھیلا کر آگے بڑھتے ہیں اور...............

اور بہن سے سریا چھوڑنے کہتے ہیں.... کئی لوگ جمع
ہیں۔ فرش پر روئی کے گدے ڈال دیے جاتے ہیں
بچوں کے رونے چلانے اور عورتوں کی چیخ پکار میں
وہ آخر بھائی کی باہوں میں گر جاتی ہیں گرتے ہی
بے ہوش ہو جاتی ہیں کیس نازک ہے۔ فوراً ہاسپٹل
لے جایا جاتا ہے۔ جہاں وقت سے پہلے جمیل فاطمہ
اپنی مرضی کے خلاف تیسرے بچے کو جنم دیتی ہیں جس کا نام

بڑے لڑکے مصطفےٰ حسن کے قافیے کی رعایت سے مقتدی
تجویز ہوتا ہے یہی مقتدی حسن آگے چل کر قافیہ کی
پابندی سے خود کو آزاد کر کے ندا فاضلی بن جاتے ہیں

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اس ولادت کی تاریخ دہلی کارپوریشن کے
رجسٹر میں ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء درج کی جاتی ہے ندا
کے والد داغ اسکول کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ شعر
مشاقی کے بل پر کہتے ہیں۔ ہر غزل میں جتنے ممکن
قافیے ہوتے ہیں سب اشعار ڈھل جاتے ہیں ان کی
یہ مہارت شاعری تک ہی محدود نہیں ہے۔ بچوں
کی تعداد میں بھی زود گوئی کی جھلک نمایاں ہے ندا فاضلی
کی زبردستی پیدائش کے بعد بھی تین لڑکے مجتبیٰ حسن
مقتدی حسن اور تسلیم اور دو لڑکیاں جاوید اور شاہینہ
عالم سے عالم وجود میں لائے جاتے ہیں۔ ان میں وہ
نام نہیں ہیں جو پیدائش کے ایک دو سال کے درمیان
اللہ کو پیارے ہو گئے۔ لیکن ندا کی جبریہ پیدائش نے
ان کی ماں کو اتنا خائف کر دیا ہے۔ کہ باقی کے بچے
ان ادویات کی روک تھام سے محفوظ رہتے ہیں
جن کے اچھے برے اثرات کی ساری جواب دہی آب
اسی کی ہے۔ سمرسٹ مام نے اپنی یادداشت
میں لکھا ہے۔ ان کی ماں دانت نکلتے وقت
ان کے گلے میں ایک تار ڈالنا بھول گئی تھیں
جس کی وجہ سے ان کے دانت ٹیڑھے نکلے ان
دانتوں کی وجہ سے چہرے کی ساخت کی وجہ سے
سارا روحانی نظام تبدیل ہو گیا۔

ندا جسمانی لحاظ سے کمزور اور مزاج چڑچڑے
ہیں۔ سال میں چھ مہینہ بیمار رہتے ہیں۔ ذرا سی
محنت تھکا دیتی ہے۔ اور موسم کی ذرا سی تبدیلی
سینہ کو جکڑ لیتی ہے۔ گھر میں سب سے الگ تھلگ ہیں
اپنی ہر ضرورت کا اظہار خاموشی کی زبان میں
کرنے کے عادی ہیں اور یوں ہی نئی نئی الجھنوں
کا شکار رہتے ہیں کبھی ماں سے ناراض ہوتے ہیں
کبھی بلا وجہ بہن بھائیوں سے خفا ہو جاتے ہیں ہمیشہ
اس شک میں مبتلا رہتے ہیں کہ والدین ان سے
زیادہ دوسروں کو چاہتے ہیں

ایک جمعرات کو...... گھر والوں کے ساتھ خواجہ
خاتون کی درگاہ جاتے ہیں زیارت کے بعد جب سب
واپس تانگے میں بیٹھتے ہیں تو یہ غائب ہوتے ہیں چاروں
طرف تلاش کیا جاتا ہے۔ ماں کا برا حال ہے۔ دو گھنٹے

بھی پریشان ہیں اور یہ اپنی دادی کی قبر سے لگے گم سم
بیٹھے ہیں۔ کبھی قیمت پر قبر چھوڑنے کو راضی نہیں ہوتے
زبردستی وہاں سے اٹھا کر لائے جاتے ہیں۔ زار و قطار
رو رہے ہیں۔ گھر آتے ہی بخار میں مبتلا ہو جاتے ہیں
یہ بخار کئی روز نہیں اترتا تو ماں کو وہم ہوتا ہے دادی
کی نیاز دلائی جاتی ہے قرآن ختم کر کے ان کا بخشا جاتا ہے
اور دم کیا ہوا پانی کئی روز ندا کو پلایا جاتا ہے! اچھے
ہونے کے بعد ہر جمعرات کو انھیں بنا سجا کر دادی
کی قبر پر لے جایا جاتا ہے

دادی کی پیدائش سے تیس پہلے انتقال
کر چکی ہیں۔ لیکن ان کے خواب میں وہ پورے چہرے مہرے
کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں اور باتیں کرتی ہیں۔ اسکول
میں اُن کے دوست بن گئے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ نام ہیرکمار
ہے۔ کھاتے پیتے گھر کا لڑکا ہے۔ اچھے خاصے جیب
خرچ کے علاوہ گھر میں چوری سے بھی کچھ ہاتھ لگ
جاتا ہے ..... پیسہ خرچ کرنے کی نئی نئی ترکیبیں
پیدا کی جاتی ہیں۔ ان ترکیبوں کو سمجھانے میں فاضی ندا
کا اہم رول ہے وہ عمر میں دونوں سے چوگنے بڑے
ہیں۔ شادی شدہ ہیں۔ دو بار الگ الگ الزام پر
دو نوکریوں سے علیحدہ کیے جا چکے ہیں۔ لیکن ان کی
نظر میں وہ ہر بار مذہبی تعصب کا شکار ہوئے ہیں
اسکول کے بعد وہ بلاناغہ ہم سے ملتے ہیں۔ ان کی
باتیں کافی دلچسپ اور حیران کن ہوتی ہیں۔

ان کے پاس ہر کام کرنے والے جن کو قابو میں
کرنے کا عمل بھی ہے اور زمین میں چھپے ہوئے خزانوں
کا پتہ لگانے کا منتر بھی ہے۔ جن انسانوں سے مختلف
ہوتا ہے وہ مسٹر ذکیس کی طرح سب کو دیکھ سکتا ہے
اسے کوئی نہیں دیکھتا وہ اگر بس میں ہو جائے تو
تو ہر خواہش کو آناً فاناً پورا کر دیتا ہے۔ شہزادی کو
محل سے اٹھاتا ہے۔ سمندر پر محل بنا دیتا ہے لیکن عمل
اور منتر کو تیار کرنے کے لیے ہر دن پیسوں کی ضرورت
پڑتی ہے جو یہ دونوں پورا کرتے ہیں۔ ہیرکمار کا باپ
مر چکا ہے۔ وہ جن کے ذریعے اپنے باپ سے مل کر
اپنے بھائی اور بھابی کی شکایت کرنا چاہتا ہے وہ اسے
مارتے ہیں اور اسے پیسے نہیں دیتے جتنی اس کو ضرورت
ہوتی ہے۔ اور ندا اس بھوت کو املی کے پیڑ سے
ہمیشہ کے لیے بھگانا چاہتے ہیں جو شام ہوتے ہی ہر
روز بیٹھا ڈراتا رہتا ہے ایک دن عمل مکمل ہونے کو
ہوتا ہے۔ بس تھوڑا سا سونا فقیر کو خیرات کرنا باقی ہے
جس کے بغیر عمل مکمل ہوتے ہوئے بھی نامکمل ہے ایک

دن بیر کمار گھر سے دو سونے کی چوڑیاں لاکر قاضی صاحب کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ ان دونوں سونے کی چوڑیوں کو کسی مخصوص فقیر کو دینے اور شام کو دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے جاتے ہیں لیکن وہ شام کبھی نہیں آتی اور جن بھی ہمیشہ کیلئے خفا ہو کر کسی اور ضرورتمند کی ضرورت پوری کرنے چلا جاتا ہے......... ہوا یوں..... چوڑیوں کے اچانک غائب ہونے سے بیر کمار کی بھابی سارا گھر سر پر اٹھا لیتی ہے۔ اور بیر کمار کا بھائی اپنے بھائی اور ندا کو بری طرح دھمکاتا ہے۔ اور گھبرا کر ندا سارا بنا بنایا کام بگاڑ دیتا ہے۔ قاضی صاحب کے یہاں سے چوڑیاں برآمد ہوتی ہیں اور قاضی صاحب چھ مہینے کے لئے اپنے جن کے ساتھ غائب ہو گئے ہیں

بیر کمار کی آنکھوں میں آنسو ہیں اس کے باپ کی دوبارہ موت ہوتی ہے ـــــ ندا گمگین ہے اسے ابلی کا بھوت پھر سے دکھائی دیتا ہے اسکول کی چھٹیاں ہو چکی ہیں جمیل فاطمہ اپنے بچوں اور چھوٹے بڑے کئی صندوقوں کے ساتھ دہلی کے پلیٹ فارم پر کھڑی ہیں ان کے بھائی خلیل احمد جواب گٹھیلے بدن کے خوبصورت جوان بن چکے ہیں۔ ان کو لینے آئے ہیں.... قلی آتے ہیں ان سے بھاؤ تاؤ کیا جاتا ہے۔ اس بیہودہ کم کی بحث میں ندا اور بڑا بھائی پلیٹ فارم کو کھیل کا میدان بنا چکے ہوتے ہیں والدہ ان کو غصہ سے دھمکا بھی رہی ہیں اور پرس سے ڈائری نکال کر بچوں اور سامان کو گن گن کر لکھے ہوئے اعداد سے ملاتی بھی جا رہی ہیں۔

خلیل احمد سائیکل پر سوار ہیں۔ اور سامان بچوں اور بچوں کی ماں سے لدا پھندا تانگہ ان کی رہنمائی میں پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ جمیل فاطمہ برقعہ پہنے تانگے والے کو بھیڑ سے آہستہ گزرنے کی ہدایت دیتی رہتی ہیں۔ اور جب تانگے والا گھوڑے کی سستی چھڑانے کو چابک کا استعمال کرتا ہے تو اسے بے زبان کو مارنے کے گناہ بھی آگاہ کرتی ہیں۔

چرند پرند سب اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ آدمی کو اللہ نے اشرف المخلوقات اسی لئے بنایا ہے کہ وہ اپنے سے جانوروں کے ساتھ رحم سے پیش آئے تانگے والا جواباً کہتا ہے۔ سچی بات ہے جی سب رب کے بندے ہیں۔ اور پھر عادت کے موافق چابک گھما دیتا ہے وہ اسے پھر ٹوکتی ہے تانگے والا

چلا کر بولتا ہے۔ اجی عورت اور گھوڑ ہنا چابک کے کہاں چلتے ہیں۔ کنڑ اسرمیرو رکے ایک اینٹوں کے دو منزلہ مکان کے سامنے تانگہ رکتا ہے گلی کے پردوں سے چہرے جھانکتے ہیں۔ کئی بچے گھوڑے کے ارد گرد کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جمیں فاطمہ اپنی ماں سے گلے لگ کر روتی ہیں۔ یہ رونا ہر بار ماں بیٹی کے ملنے کی رسم ہے وہ گو ا لبار آئیں یا دہلی جائیں محبت کے اظہار کے لیے کچھ آنسو ضرور خرچ ہوتے ہیں۔ پاس پڑوس کی عورتیں بھی ان آنسوؤں میں شامل ہوتی ہیں ان کے آنچل بھی بھیگتے ہیں۔ بچوں کے سمجھ میں کچھ نہیں آتا وہ سب کو روتا دیکھ کر خود بھی بسورنا شروع کر دیتے ہیں۔ بچوں کو بسورتا دیکھ کر جمیں فاطمہ رونا ختم کر دیتی ہیں۔ اور بچوں کو لے کر اندر داخل ہو جاتی ہیں

خلیل احمد اپنی بہن سے دو سال بڑے ہیں نہایت نیک اور مذہبی انسان ہیں۔ جوانی ہی میں مسجد کے پتھروں نے سرخ اجلی پیشانی پر کالا نشان ابھار دیا ہے

بڑی چھوٹی کئی حویلیاں ہیں۔ ان کے کرائے کی آمدنی کافی معقول ہے بے فکری پانچوں وقت نماز پڑھتے ہیں۔ اکھاڑے جا کر کثرت کرتے ہیں۔ گھر آ کر دودھ پیتے ہیں اور شام کو چھت پر چڑھ کر کسی بچے کے ہاتھ میں چرخی دے کر پتنگوں کے پیچ لڑاتے ہیں۔ پتنگ کاٹتے ہیں تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اور جب اپنی پتنگ کٹتی ہے تو اسے خدا کی مرضی سمجھتے ہیں ○

ٹرانسی ٹیلر
لیڈی سوٹ اسپیشلسٹ
پروپرائیٹر
صلاح الدین انجم
بلاک کے پیچھے
SIRONJ

غزلیات (فرحا)

بات کم کیجے ذہانت کو چھپاتے رہیے
اجنبی شہر ہے دوست بناتے رہیے

دشمنی لاکھ ہی سہی ختم نہ کیجے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

یہ تو چہرے کا فقط عکس ہے تصویر نہیں
اس پہ کچھ رنگ ابھی اور چڑھاتے رہیے

غم ہے آوارہ اکیلے میں بھٹک جاتا ہے
جس جگہ رہیے وہاں ملتے ملاتے رہیے

جانے کب چاند بکھر جائے گھنے جنگل میں
گھر کی چوکھٹ پہ کوئی دیپ جلاتے رہیے

محبت میں وفاداری سے بچیے
جہاں تک ہو اداکاری سے بچیے

ہر اک صورت بھلی لگتی ہے کچھ دن
لہو کی شعبدہ بازی سے بچیے

شرافت۔ آدمیت۔ دردمندی
بڑے شہروں میں بیماری ہے بچیے

ضروری کیا ہر اک محفل میں بیٹھیں
تکلف کی روا داری سے بچیے

بنا پیروں کے سر چلتے نہیں ہیں
بزرگوں کی سمجھداری سے بچیے

ناشر "سوالوں کی بوچھار" کے بعد
رؤف جاوید
کا
دوسرا مجموعہ کلام
"رقص زندگی"
منظر عام پر
رابطہ:-
ادارہ تصنیف ڈی۔۷
ماڈل ٹاؤن دہلی۔ ۹

مختلف ادوار کی شاعری میں عورت
کے تصور کو شعرائے اردو نے جس طرح
پیش کیا ہے اس کا مفصل جائزہ
اردو شاعری میں
عورت کا تصور
نادیہ اتم
۷ بی۔ کے سندھی کالونی مین روڈ۔ اندور

غزل

من بیراگی تن انوراگی قدم قدم دشواری ہے
جیون جینا سہل نہ جانو بہت بڑی فنکاری ہے

اوروں جیسے ہو کر بھی ہم باعزت ہیں بستی میں
کچھ لوگوں کا سیدھا پن ہے کچھ اپنی عیاری ہے

جب جب ہم جھوما ہم نے کپڑے پھاڑے شور کیا
ہر موسم شدت رضا کوری دنیا داری ہے

یہ مت پوچھو وہ اچھا ہے یا اچھی ناداری ہے
جو چہرہ دیکھا وہ توڑا نگر نگر ویران لگے

پہلے اوروں سے ناخوش تھے اب خود سے بیزاری ہے

نظم - آدمی کی تلاش

ابھی مرا نہیں
زندہ ہے آدمی شاید
یہیں کہیں اسے ڈھونڈو یہیں کہیں ہوگا
بدن کی اندھی گپھا میں چھپا ہوا ہوگا
بڑھا کے ہاتھ
ہر اک روشنی کو گل کر دو
ہوائیں تیز ہیں جھنڈے لپیٹ کر رکھ دو
جو ہو سکے تو ان آنکھوں پہ پٹیاں کس دو
نہ کوئی پاؤں کی آہٹ
نہ سانسوں کی آواز
ڈرا ہوا ہے وہ
کچھ اور بھی نہ ڈر جائے
بدن کی اندھی گپھا سے نہ کوچ کر جائے
یہیں کہیں اسے ڈھونڈو
وہ آج صدیوں بعد
اداس اداس ہے
خاموش ہے
اکیلا ہے
نہ جانے کب کوئی بجلی بھڑک اٹھے اس پر
یہیں کہیں اسے ڈھونڈو یہیں کہیں ہوگا
برہنہ ہو تو اسے پھر لباس پہنا دو
اندھیری آنکھوں میں سورج کی آگ دہکا دو
بہت بڑی ہے یہ بستی کہیں بھی دفنا دو
ابھی مرا نہیں ......
زندہ ہے آدمی شاید !!

تمنا علی

بمبئی

یہ کیسی بستی ہے
میں کس طرف چلا آیا
فضا میں گونج رہی ہیں ہزاروں آوازیں
سلگ رہی ہیں ہواؤں میں ان گنت سانسیں
جدھر بھی دیکھو
کھوے کو ملے پنڈلیاں ٹانگیں
مگر کہیں کوئی چہرہ نظر نہیں آتا
یہاں تو سب ہی بڑے چھوٹے
اپنے چہروں کو
چمکتی آنکھوں کو، گالوں کو، ہنستے ہونٹوں کو
سروں کے خول سے باہر نکال لیتے ہیں
سویرے اٹھتے ہیں جیبوں میں ڈال لیتے ہیں
عجیب بستی ہے۔
اس میں نہ دن نہ رات نہ شام
بسوں کی چیخ سے سورج طلوع ہوتا ہے
جھلستی ٹین کی کھولی میں چاند سوتا ہے
یہاں تو کوئی نہیں، کس کا بت گراؤں میں
خموشیوں میں کہیں گھٹ کے مر نہ جاؤں میں
یہ کیسی بستی ہے
میں کس طرف چلا آیا

پاسپورٹ افیسر کے نام

کراچی ایک ماں ہے
بمبئی بچھڑا ہوا بیٹا
یہ رشتہ پیار کا پاکیزہ ہے جسے
اب تک
نہ کوئی توڑ پایا ہے
نہ کوئی توڑ سکتا ہے
غلط ہے ریڈیو، جھوٹی ہیں سب اخبار کی خبریں

نہ میری ماں کبھی تلوار تانے رن میں آئی ہے
نہ میں نے اپنی ماں کے سامنے بندوق اٹھائی ہے
یہ کیسا شور و ہنگامہ ہے
یہ کیسی لڑائی ہے - ۵۵ -

خدا خاموش ہے

بہت سے کام ہیں
لپٹی ہوئی دھرتی کو پھیلا دیں
درختوں کو اگائیں، ڈالیوں پر پھول مہکا دیں
پہاڑوں کو قرینے سے لگائیں
چاند لٹکائیں
خلاؤں کے سروں پہ نیلگوں آکاش پھیلائیں
ستاروں کو کریں روشن
ہواؤں کو گتی دے دیں
پھدکتے پتھروں کو پنکھ دیکر نغمگی دیدیں
لبوں کو مسکراہٹ
انکھڑیوں کو روشنی دیدیں
سڑک پہ ڈولتی پرچھائیوں کو زندگی دیدیں

خدا خاموش ہے تم آؤ تو تخلیق ہو دنیا
میں اتنے سارے کاموں کو اکیلا کر نہیں سکتا۔

(پہچان) ہاجرہ بیگم کی نذر

نہیں یہ بھی نہیں
یہ بھی نہیں
یہ بھی نہیں
وہ تو
نہ جانے کون تھے
یہ سب کے سب تو میرے جیسے ہیں
سبھی کی دھڑکنوں میں ننھے چاند روشن ہیں
سبھی میری طرح سے وقت کی بھٹی کے ایندھن ہیں
جنھوں نے میری کٹیا میں اندھیری رات میں گھس کر
میری آنکھوں کے آگے
میرے بچوں کو جلایا تھا
وہ کوئی اور تھے
وہ چہرے تو کہاں اب ذہن میں محفوظ ہیں صاحب
مگر ہاں
پاس ہو سونگھ کر پہچان سکتی ہوں
وہ اس جنگل سے آئے تھے۔

ندا فاضلی کا ایک خط خدیجہ اختر کے نام

برادرم سیفی سرونجی صاحب

ندا فاضلی نمبر کے لئے ندا ہی کا ایک مکتوب بنام خدیجہ اختر ملفوف ہے جو آپ اپنے اندر ایک دنیا رکھتا ہے۔ اس وقت بہت مصروف ہوں ورنہ آپ کی تمنا ضرور پوری کرتا اور ایک اچھا سا مضمون ارسال کرتا۔ نامساعد حالات کے باوجود آپ ادب کی جو خدمت کر رہے ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ بہت ذہن پرائیوٹ اکادمیوں کالجوں اور اداروں کو حقیر سمجھتے ہیں جبکہ ان اداروں ہی سے بڑے کام ہوتے ہیں۔

آپ کا اخلاق اثر

خدیجہ آپا

اختر بھائی اچھے ہیں۔ آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ جہاں وہ سوتے ہیں وہاں آپ کے کپڑے رکھے ہوئے ہیں۔ صبح اٹھتے وقت اور رات کو خوابوں کی دنیا میں جانے سے پہلے وہ ان کو چھو کر ٹٹول کر دیکھ لیتے ہیں۔ اب یہ کپڑے ان کی شاعری میں کیسے کیسے روپ بدل کر ابھریں گے۔ کس کس رنگ میں پگھل کر الفاظ بنیں گے یہ نئی غزلیں سن کر ہی معلوم ہوگا وہ کچھ شعر و خط ان کو سنانے کے لئے ہیں

میں کل بھی اختر بھائی کے پاس گیا تھا اپنے دوستوں کے ساتھ بیچارے اکیلے بیٹھے تھے۔ لیکن نظریں ادھر ہی تھیں جہاں بستر کے سرہانے شیشے کے دائروں میں آپ چھپی ہوئی تھیں آپ پوچھیں گی کہ بستر کے سرہانے کی بات مجھے کیسے معلوم ہوئی تو سنیئے۔ ساڑھے گیارہ بجے تک پینے کے بعد اور پیاس بڑھی۔ اندر باہر کولمبس کی طرح انجانے سفر کی تلاش شروع ہوئی اور پھر ایک جگہ نہ جانے کب کی رکھی ہوئی ایک بوتل ہاتھ لگی جس میں صرف ایک پیگ تھا۔ اس انجانی سفر کے دوران ناشتے کے

Ashok T.V. centre
Electric parts
Stereo Duke
&
T.V. Seller
Chota Bazar
SIRONJ 464-228

باقی انڈے ٹھیک نکلے۔ انڈوں کو بھگونے میں
پھینٹا گیا ہر آدمی اپنی اپنی جانکاری کا ثبوت
دینا چاہتا تھا۔ نئے نئے اسٹائل سے مرغے
مرغیوں کی نسل کو تباہ کیا جا رہا تھا پوری تباہی
ہو چکی تو کچن پر حملہ کیا گیا۔ کھڑکی سے محترمہ بلی صاحبہ
اجنبیوں کو دیکھ کر غرائیں اور سیدھی کیمرہ میں
کے سربراہ آن پڑیں دو گھنٹے تک بال سنوارنیوالا
کیمرہ میں رات بھر کسی کو صورت دکھانے کے قابل
نہیں رہا۔۔۔۔۔ انڈوں کا قیمہ بننے والا تھا ہمارے
ڈائریکٹر صاحب سے جب الہ آباد میں تھے ان کی
ماتاجی نے کہا تھا۔ پیاز اس وقت بکتی ہے جب
لال ہو جاتی ہے قیمہ بناتے وقت انکو ماتاجی کے
مقدس الفاظ یاد آگئے اور آپ کی مہینہ بھر کی
گیس عاشق کی آہوں کی طرح شور کرتی ہوئی
ضائع ہوتی رہی۔ میں نے دو تین بار آواز لگائی
اختر بھائی نے تخت طاؤس پر بیٹھے بیٹھے اپنے مخصوص
انداز میں کہا۔۔۔ بھائی بس بھی کرو۔۔۔۔
بہت ہو گیا۔ میرا عالم بھی پیٹ پر پتھر باندھنے کی
حد تک غیر ہو رہا تھا مگر وہ ماں کا فرمانبردار پوت
پیاز کو کمیونسٹ (سرخ) بنانے پر تلا ہوا تھا

خدا خدا کر کے اس کی دو ڈبیاں ہا قیمتی سائونٹ
دو گھنٹوں کی محنت سے سنوارے ہوئے بال اور
بالٹیوں پسینہ خرچ کر کے محترم قیمہ صاحب بن سنور کر
سامنے آئے۔ اب خیال آیا جب انڈے اور پیاز
لینے نیچے اترے تھے تو روٹیاں لانا بھول گئے کیا کیا
جائے۔ پندرہ منٹ تک سوچ بچار کیا گیا۔ بنا
بحث کے کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں۔

جب بیٹھ کے سوچیں گے تو کچھ بات بنے گی
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
تھک ہار کر اندھیرے کے جنگل میں اترنا پڑا
اور تلاش گندم شروع کی
عشق دنیا سے بے خبر ہے مگر
پیٹ کی بات جان لیتا ہے

ایک گھر نما دوکان پر دستک دی۔ لنگی
باندھے ہوئے بکھرے بالوں کے ساتھ ایک صاحب
باہر نکلے۔ نہایت ناراض، آنکھیں چڑھی ہوئی منہ
سرخ۔ اندر سے بڑبڑانے کی آواز آ رہی تھی شاید
اس کی بیوی مجھے ماں، بہن، بھائی دوست اور
نہ جانے کس کس کی گالیاں دے رہی تھی۔ بات
بھی ٹھیک تھی نیند کنوا کے رہنا حرج نہیں ہے

دائروں میں چھپی ہوئی آپ بھی نظر آگئیں (کرے)
شراب کے بعد کھانے کی ضرورت ہوئی۔ تو
دوکانیں بند۔ اختر بھائی کے کباب جو نسیم صاحب
لاکر رکھ گئے تھے۔ شراب کے ساتھ کباب بن گئے
تھے

رات کے بارہ بجے پالی کی دوکان کھلوائی
گئی۔ آٹھ انڈے لئے۔ پیاز لی اور واپس آئے کچن
میں گھسنے پر پتہ لگا گھی نہیں ہے محلے والوں کے دروازے
بجائے گئے۔ نوح صاحب کا شعر ہے

کھڑا ہیں دیر سے دروازہ پر آواز دیتا ہوں
نہ وہ اندر بلاتے ہیں نہ وہ باہر نکلتے ہیں

نشہ میں آدمی بے حیا ہو جاتا ہے بار بار
گھنٹی بجائی تب کہیں اندر سے آواز آئی اور ہماری
جان میں جان آئی۔ کہیں سے تیل مانگا کہیں سے
چار ہری مرچیں لائی کہیں...... اور کہیں سے
کچھ نہیں ملا۔ رات کے بارہ بجے الہام ہوا ہندوستان
میں واقعی بہت غریبی ہے

بنا کر فقیری کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

ساری کائنات کا پلان بنا کر خدا کو تخلیق کا
خیال آیا......

میرے ایک دوست نے
پیاز کاٹی۔ نشہ کے عالم میں اس کی آنکھیں
دیکھیں تو لگا بے چارہ گھر سے بہت دنوں سے الگ
اس لئے رو رہا ہے۔ میں نے تسلی دینے کی کوشش
کی لیکن آنسو تھے کہ آنکھوں سے ڈھلتے ہوئے
رخساروں سے گزرتے ہوئے ٹھوڑی سے گرتے
ہوئے قمیص کے کالر تک پہنچ رہے تھے۔ شاید اس نے
پہلی بار پیاز کاٹی تھی ایک دو بار اور کاٹے گا
تو عادت ہو جائیگی۔

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

پیاز کاٹ کر ایک دوسرے دوست نے ڈپٹی انسٹی
ٹیوٹ کا ڈائریکٹر) انڈے توڑے پہلے انڈے کا
منہ کھلا تو معلوم ہوا بے چارہ بے قصور ایک
جاندار کا قاتل بن گیا۔ نشہ میں تو ہر آدمی مہاتما
گاندھی ہو جاتا ہے اہنسا وادی۔ ضمیر کی آواز
نے شور کیا تو اٹھا اور نہایت احترام سے اس بیجان
جاندار کو پانی کی موجوں میں دفنا آیا

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

- بقیہ ص ۱۷۹ پر -

ندا فاضلی کے خطوط

ڈاکٹر خورشید سمیع کے نام

برادرِ محترم

آپ اچھے ہونگے۔ مجموعے کی رسید کے طور پر آپ کا خط ملا تھا۔ لیکن میں اس غلط فہمی میں تھا کہ آپ آنکھ اور خواب کے درمیان پر کسی رسالہ میں تبصرہ تحریر فرمائیں گے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ آپ نے اپنے تاثرات اس رسیدی خط تک محدود کر دیے تھے۔

بھائی میرے۔ اردو کی کتابیں اُن تک کیسے پہونچیں جن تک انہیں پہونچنا چاہیے یا جنھیں پڑھنے کا شوق ہے۔

میں مشاعروں کے بہانے مختلف علاقوں میں بھٹکتا رہتا ہوں۔ ہر جگہ اردو والے بھی ہیں کتابیں خریدنے کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ مگر اُن تک کتاب کی اطلاع ہی نہیں پہونچتی۔ ہمارے پاس اچھے ادارے تو نہیں ہیں (distribution) کے بھی معقول ذرائع نہیں ہیں صرف یہ ہی ہے کہ اچھے رسالے میں اچھے تبصرے شائع ہو جائیں اور تھوڑے بہت فاصلے میں لوگ اس سے باخبر ہو جائیں۔ خیر چھوڑیے۔

نئی کہانیوں پر آپ کا مضمون میں نے پڑھا تھا آپ کی انتقادی سوجھ بوجھ تخلیقی اور استدلالی ہے نئے ذہن کے مزاج آپ پہچانتے ہی ہیں ان عوامل پر بھی آپ کی نظر رہتی ہے جو اس کی تعمیر میں شامل ہیں ہماری تنقید کا زیادہ حصہ لفاظی کا شکار ہے۔ افہام تفہیم کے وہ نئے دائرے۔ فکری سیاق و سباق کے سلجھے ہوئے حصار پہ دسترس سے باہر نظر آتے ہیں۔ ہر شخص اپنا فارمولا لیے تنقید کی کھونٹیوں پر تخلیقات کو ٹانگ دیتا ہے۔ اور جو تخلیقی ذہن سے بنائے فارمولوں کے بجائے ادب کی نئی اقدار کا مطالبہ کرتا ہے وہ دھندلکوں میں کھو جاتا ہے حالانکہ یہ دھندلکے وقتی ہوتے ہیں۔ اور (calamity) بہر طور اپنے آپ کو منوا کر رہتا ہے۔ لیکن اس طرزِ عمل سے ادبی سطحیت اتنی رائج ہو جاتی ہے کہ اچھے بھلے ذہن بھی اس کے اسیر ہونے لگتے ہیں مجھے آپ کی تنقید اس لیے اچھی لگتی ہے کہ آپ دوسروں کی طرح علم کی جگالی نہیں کرتے۔ تخلیق کے واسطے سے ہی تخلیقی ذہن اور اس کی بنتی بگڑتی اقدار تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں۔

ادب دراصل اظہار کا مسئلہ ہے اور اظہار شخصیت کے شعور کا۔ اس شعور کو الگ الگ لوگ الگ الگ ناموں سے پکارتے ہیں۔ کبیر داس اسے انوبھو کہتے ہیں۔ غالب اسے دل گداختہ مانتے ہیں۔ اور اٹلی کا نیا شاعر اسینو یو رنا اس کیلئے (Begin from Zero) کی اصطلاح گڑھتا ہے۔

میرے خیال میں زبان و بیان کے طے شدہ سانچے اس شعور کے بنا ہماری تخلیقی کمزوری یا عادت بن جاتے ہیں۔ جن سے چھٹکارہ حاصل کئے بنا اپنے لہجے کی دریافت، یا شخصیت کا شعور ممکن نہیں۔

تنقید کا رول بھی یہی ہے۔ نقاد اپنے عہد میں تخلیقی تساہل یا موروثی عادات کے جمود توڑتے ہیں۔ کہاں تک کامیاب۔ اسی سے اس کی شناخت کی جاسکتی ہے۔

آپ کے شاعر والے مضمون اور شیرازہ کے مضمون کا منتظر ہوں۔

مظہر امام نہایت سلجھے ہوئے باشعور شاعر ہیں نئی شاعری کی فارمولات نے انہیں ہیجان زدہ نہیں کیا۔ یہی ان کی تخلیقی توانائی کا ثبوت ہے۔ آپ اچھے ہونگے جواب ضرور دیں۔ خیر طلب ندا فاضلی

ڈاکٹر مسیح صاحب

پٹنہ میں مختصر سی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد آپ کا ایک خط ملا۔

اپنی شاعری کے بارے میں آپ کی رائے جان کر واقعی خوشی ہوئی۔

آپ کی تجزیاتی نظر اور تنقیدی دور بینی نے ملاقات کے وقت بھی متاثر کیا تھا۔ آپ کی تحریروں نے اس تاثر کو مزید گہرا کیا

آپ کے مضامین اور کہاں کہاں پڑھنے کو ملیں گے۔ مطلع فرمائیں۔

ہاں بھائی۔ آپ نے شاید لکھا تھا کہ آپ نے میری شاعری پر کوئی مضمون شروع کیا ہے اس کا کیا حشر ہوا

لمحے لمحے (بدایوں) مسلسل مجھے لکھ رہے ہیں وہ اس رسالہ میں کچھ صفحات میرے لئے ضائع کرنا چاہتے ہیں۔

اگر وہیں میرا آپ کا مضمون بھی شائع ہو سکے تو اچھا ہو

میرا تیسرا مجموعہ "آنکھ کو جام لکھو" عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ چھپتے ہی آپ کو پوسٹ کرونگا۔

قاسم خورشید اور دیگر دوستوں سے سلام کہیں۔ آپ اچھے ہونگے اور ہمیشہ کی طرح علمی کاموں میں معروف

آپ کے جواب کا منتظر۔ ندا فاضلی

۴۰۔

بھائی خورشید سمیع تسلیم

آپ کی خیر خبر تو آپ کے مضامین سے ملتی رہتی ہے
آپ جس سنجیدگی سے ادبی پیچیدگیوں کو سلجھاتے ہیں
اس میں آپ کی شعوری انفرادیت کے ساتھ آپ کی
عرق ریزی کے بھی دیدار ہوتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے
آپ ساری نمائشی ہنگامہ آرائیوں سے دور رہ کر کس طرح
اپنی گوشہ نشینی کو ادب تہذیب کی پل پل بدلتی قدروں
کی تلاش و جستجو سے ہم رشتہ کیے ہوئے ہیں۔

آج کے تیز رفتار دور میں جہاں کام سے زیادہ
نام کا سکہ رائج ہو وہاں ہر جا ہم جہاں دیگر کی تلاش
کا کون خدشہ مول لیتا ہے۔ زبانی تنقیدی، کتابی ارشادات
اور فارمولاتی احکامات کی بھیڑ میں سنبھلی ہوئی تخلیقی
تحریریں وقتی طور پر بھلے ہی نمایاں نہ ہوں۔ لیکن ان کا
اثر دیرپا ہوتا ہے۔ انہیں دبایا جا سکتا ہے ان کے اثرات
کے پھیلاؤ کو روکا نہیں جا سکتا۔

میں آپ کی سوجھ بوجھ کی بے لاگی کا شروع ہی سے
قائل ہوں۔ آپ اپنے ہر مضمون میں نئے سرے سے
چونکاتے بھی ہیں اور نئی طرح سے اپنے آپ کو متعارف
بھی کراتے ہیں۔ یہ ہی ذہنی تخلیقیت کا ثبوت بھی ہے

سردار صاحب کے خطوط آپ محفوظ رکھیں
صابر دت۔ فن اور شخصیت کا ایک نمبر ان پر نکالنے
کا ارادہ کر رہے ہیں۔ وہ شمارہ بھی ان کے دیگر شماروں
کی طرح اچھے ہاتھوں میں جائے گا۔ اور ان خطوط
کی اشاعت کا اثر بھی دیرپا ہوگا۔ میں انہیں آپ کا
پتہ دے رہا ہوں۔ وہ جلدی رابطہ کریں گے۔

آج کل میں آپ کے مضمون کا منتظر ہوں۔
دیواروں کے بیچ کی اشاعت کی فکر میں ہوں۔ یہ
کتاب اردو اور ہندی میں ایک ساتھ شائع ہوگی
کتاب شائع ہوتے ہی اس کی پہلی کاپی آپ کو
ہی پوسٹ کرونگا۔

کبھی کبھی اسی طرح یاد کر لیا کیجئے۔ دوستوں کے
خطوط وقت کے عذاب میں سکون کے کچھ لمحے فراہم
کر دیتے ہیں۔

اپنے مضامین کی کتاب بھی شائع کرائیں آج کل تو
الکامپیوٹر نے کافی اشاعتی سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں
خیر طلب۔ آپ کا مداح
ندا فاضلی

(۲)

برادرم خورشید صاحب

شاعر کے نئے شمارہ میں آپ کا مضمون

تنقید کا نفسیاتی دبستان بہت خوبصورت ہے

آخر میں یہ جملے - ہونا یہ چاہیے تھا کہ شاعر

وہ باتیں پیش کرے جنہیں وہ پیش کرنا چاہتا ہے

نہ کہ وہ جو تنقید کا اہم موضوع بن چکی ہیں۔ پچھلے

پندرہ بیس سال شاعری کے ایک بڑے حصے کا

نہایت جامع اور طلب تجزیہ ہے

میری طرف سے اس کے لئے مبارکباد

قبول کریں۔ اور خطوں کے جواب دینے کی

عادت ہو تو خیریت سے مطلع بھی فرمائیں

آپ اچھے ہونگے۔ خیر طلب

ندا فاضلی

بقیہ۔ (عذرا بجیہ اختر کے نام)

لیکن کسی شادی شدہ جوڑے کے خوبصورت

اندھیروں کو جگانا بہت برا ابرادہ ہے جیسے میں نے

دلتوں اور گالیوں کے ساتھ

ہاتھ لگیں اور اس طرح آٹھ بجے

جو عیش شروع کیا تھا وہ ڈیڑھ بجے رات کو

بخیر و خوبی تمام ہوا۔

عذرا جی سے سلام کہیے ان سے کہیے فیل

ہونے یا تھرڈ کلاس پانے والے

ہوتے ہیں۔ رٹ رٹا کر کامیاب

تو بے وقوف ہوتے ہیں۔ سعید اور صاحب

سے بھی سلام کہیے۔

آپ کب آ رہی ہیں شفیقہ صاحبہ کیسی ہیں؟

میری کتاب پر تبصرہ کب کرینگی۔

آپ کا

ندا فاضلی

کے ساتھیوں میں تھا۔ اسلئے جب ہم لوگ یعنی طاؤس منصوری ندا فاضلی، مظفر حنفی اور میں جب کبھی تنہا یا ایک ساتھ کہیں یکجا ہو جاتے تھے تو ہم لوگوں کا موضوع گفتگو اکثر جدیدیت ہی رہتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ندا فاضلی کے قیام کے دوران "حلقۂ دانشوراں" کا ماہانہ جلسہ ڈاکٹر راہ محمد ترکے خسر ناظم صاحب کے مکان پر منعقد ہوا تھا۔ حلقۂ دانشوراں کے بانی حضرت کوثر چاندپوری مرحوم تھے۔ اس کے ماہانہ تنقیدی جلسوں میں تمام اصناف ادب (افسانہ، نظم، مضمون، غزل وغیرہ) تنقید کیلئے پیش کی جاتی تھیں جس میں بھوپال کے دانشوران علم و ادب حصہ لیتے تھے۔ ندا فاضلی کے قیام کے دوران جو "حلقۂ دانش وراں" کا جلسہ ہوا تھا اس میں میں نے تنقید کے لئے اپنی غزل جس کا مطلع ہے ؎

"ہر اک زخم جگر رشک چمن ہے ॥ مرا دل کیا ہے اک انجمن ہے"

پیش کی تھی۔ اس جلسہ میں حضرت کوثر چاندپوری مرحوم، حضرت شفا گوالیاری مرحوم، ڈاکٹر ابو محمد سحر، اختر سعید خاں، احمد علی تاج مرحوم، عشرت قادری، ندا فاضلی وغیرہ کے علاوہ گوالیار سے آئے ہوئے مہمان شاعر پریم کشب سوز نے بھی شرکت کی تھی۔ سوز صاحب ندا صاحب کے والد محترم حضرت دعا ڈبائیوی کے جانشین کہے جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میری غزل کا مقطع ؎

"ترے ہر شعر میں واحد پریمی ॥ نگار زندگی کا بانکپن ہے"

سوز صاحب نے یہ اعتراض کیا تھا کہ مقطع میں "پریمی" کا تلفظ صحیح نہیں ہے جس کا جواب میرے بجائے ندا فاضلی نے دیا تھا اور نہایت بھرپور اور مدلل انداز میں دیا اور سوز صاحب کو اپنا اعتراض واپس لینا پڑا۔ ندا صاحب نے دیگر تخلیقات کی تنقید یا مباحثہ میں بھی حصہ لیا اور اپنی فطری ذہانت اور علمی لیاقت کا لوہا منوایا۔ میں تو خیر پہلے سے ان کا بہت معترف تھا اور آج تک ہوں۔

ندا صاحب سے میری مراسلت بھی رہی ہے مشاہیر کے خطوط کے انبار میں سے فی الحال ندا صاحب کے چار خطوط دستیاب ہوئے ہیں، جب کہ ان کے اور بھی خطوط ہونے چاہیئے۔ بہرحال ندا صاحب کے یہ دستیاب شدہ چار بھی غیر اہم نہیں ہیں بلکہ ان کی شخصیت کے ترجمان ہیں لہٰذا پیش ہیں:۔

(۱)

واحد صاحب

خط لکھنے بیٹھ گیا لیکن اب سوچ رہا ہوں کیا لکھوں ...... چار پانچ دن پہلے تو ملاقات ہوئی تھی ...... سب کچھ تو کہہ سن لیا تھا۔ مگر تمہاری پرخلوص شکایتوں کے احساس نے چین ہی نہیں لینے دیا!!

(۴) واحد صاحب!!

کیسے ہو تمہاری خیریت تو عشرت بھائی سے معلوم ہوتی رہتی تھی!

میں! ہاں اچھی طرح ٹھیک ہوں - زندگی کٹ رہی ہے کو ہے..........

"   " کا کیا ہوا! کیا بند ہو گیا

اختر نظمی آج کل بھوپال ہی ہونگے - جانے ان کا پتہ کہاں گم ہو گیا - سلام تو کہہ دینا!!

اور خفی صاحب تو جیسے بھول ہی گئے شاد عارفی مرحوم پر انکی کتاب ہے، بہت خوب ہیں میری طرف سے مبارکباد!!!

قبلہ شفا صاحب کی خدمت میں سلام!

اور کہو!

تمہارا ندا فاضلی

مذکورہ خطوط میں تاریخ درج نہیں ہے لیکن یہ ۶۶ء اور ۶۵ء کے تحریر کردہ ہیں ویسے ڈاکخانہ کی مہروں سے بھی تاریخ کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا لیکن ندا صاحب کی محبت اپنائیت کا ضرور اندازہ ہوتا ہے جس کا میں گرویدہ ہوں پھر بمبئی جانے کے بعد ندا صاحب سے میری مراسلات ختم ہو گئی ہے لیکن ان سے محبت اور اپنائیت بدستور قائم ہے - یہ جب بھی بھوپال آئے ہیں تو مجھے ضرور ملے ہیں اسی سابقہ اور محبت اور اپنائیت کے ساتھ - جسکی میں دل سے قدر کرتا ہوں -

"احتساب" کا شمارہ نمبر ۱۰/۹ سال ۱۹۹۱ء کے صفحہ نمبر ۳۶ پر شائع تحریر سید م۔ رضا صاحب کی ہے جسکو پڑھنے کے بعد جو سوالات جو قائم ہوتے ہیں ان کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں لیکن اس سے قبل میں ان باتوں کی طرف اشارہ کروں جو رضا نے اپنی تحریر کے ذریعے ندا اور انکے شعر کے تعلق سے کہی ہیں

(۱) جناب رؤف جاوید کا یہ بیان کہ فراق نے ندا فاضلی کے (زیر بحث شعر) کو سننے کے بعد کہا تھا کہ ندا فاضلی کل کے ہندوستان کا بڑا شاعر ہوگا صداقت پر مبنی نہیں ہے (بقول م۔ رضا کے)
(۲) ندا کے ایک ہی شعر کو پڑھکر ندا کو ادنیٰ معمولی کردار کا مالک ٹھہرانا۔
(۳) شعری رویے میں شاعر اپنے دوست یا ملاقاتی سے بچکر گزر گیا ہے اسلئے شاعر کو سخت دل و اخلاق سے گرا ہوا، معمولی قرار دینا۔
(۴) زیر بحث شعر کا موضوع الفاظ وغیرہ کے لیے یہ کہنا کہ وہ غزل کے مزاج سے تعلق نہیں رکھتے وغیرہ۔

ان سوالات کا جواب دینے سے قبل یہ بات قابل غور ہے کہ آخر م۔ رضا نے ندا کے اس شعر کے متعلق کیا تنقید، تنقیص، تفہیم، تبصرہ، ترجمہ، تجزیہ آخر کیا لکھا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جبکہ ادب کی تمام اصناف کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں خیر جو کچھ لکھا ہے وہ کیا ہے یہ بات تو م۔ رضا ہی بہتر طریقے سے جانتے ہیں۔ میں تو اس طرح کی تحریر کو صرف کردار کشی کرنے کے علاوہ اور کوئی دوسرا نام نہیں
کسی شعر کو پڑھکر اسکے لفظی معنی دریافت کرنے سے بات پوری نہیں ہو جاتی شعر کو موضوع، جذبات، تخیل، شرح، ریاضی سوال کی طرح بندھے ٹکے ۲ اور ۲ چار کے اصول پر مبنی نہیں ہوتا ہے۔

بہر حال اب میں ان سوالوں کے جواب دوں جو م۔ رضا نے اپنی تحریر میں ندا اور انکے شعر کے متعلق سر کے بل کھڑے کر دیئے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ م۔ رضا رؤف جاوید کے بیان کو مشکوک مانتے ہیں اور فراق کی بات سے حیرت زدہ ہیں کہ فراق جیسے عظیم شاعر ندا کے اس شعر پر جو معمولی ہے "بقول رضا کے" اتنی بڑی بات کہی ہے کہ یہ شخص ۔۔

کے ہندوستان کا بڑا شاعر ہوگا۔
اسکے لئے تو صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ مومن کے ایک شعر پر غالب نے اپنا پورا دیوان دینے کی بات کہی تھی اور ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں۔ اسی ایمانی حرارت سے میں رؤف جاوید کی بات کو خلوص پر مبنی سمجھتا ہوں اور فراق کی بات کو تسلیم کرتا ہوں۔
دوئم :۔ ندا کے شعر کا موضوع اور الفاظ غزل کے مزاج سے الگ نہیں کھاتا تو یہاں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ غزل، نظم کے موضوعات، استعارات الفاظ کیلئے افلاطون، ڈرائیڈن، سٹرتی، مولوی عبدالحق، احتشام حسین وغیرہ نے غزل اور اسکے مواد کا ایسا کوئی انسائیکلوپیڈیا تیار نہیں کیا ہے جس سے معلوم ہو کہ فلاں موضوع، الفاظ غزل کے ہیں اور فلاں نظم یا دیگر شاعری

کے اصناف کے
ہو سکتا ہے رضا کے ہاتھ اس قسم کا کوئی چارٹ ہاتھ لگا ہو تو وہ اسے احتساب کے اگلے شمارہ میں شائع کرواکر دور حاضر کے شعراء حضرات کی مدد فرمائیں ادب میں بےجا حدود بندی کا میں خود بھی قائل نہیں ہوں۔ ادب تو ایک ایسا آئینہ ہے جس میں فنکار کے عہد کا جس میں وہ

سانس لے رہا ہے ہوبہو عکس نظر آئے۔

سوئم :۔ ندا کے ایک شعر کو پڑھنے کے بعد رضا کا یہ رویہ بھی عقل سے پرے ہے کہ صرف ایک شعر کو پڑھکر ہی شاعر کی پوری زندگی اسکے دل و دماغ، کردار کیلئے فتویٰ جاری کر دیا کہ ندا ادنیٰ اور معمولی کردار کا مالک ہے۔

رضا کے اس قسم کے ٹیسٹ (Test) پر تو ہنسی آتی ہے شعر کی شرح مطلب کوئی امور خانہ داری سے متعلق دیگ میں پکائے جارہے چاولوں کی کنی دیکھنے کا عمل تھوڑی ہے کہ آپنے ایک چاول دیکھکر پوری دیگ کے چاول کا اندازہ لگالیا۔ شاعر کی دیگ میں تو ایک چاول کچا رہ جانے پر بھی پوری دیگ پکی ہوتی ہے۔
کسی مصنف، شاعر کی شاعری کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کیلئے اس کی زندگی کا ایک واقعہ [illegible] کافی نہیں ہوتا اسکو تو اسکے کل [illegible] رکھ کر دیکھا جاتا ہے۔ اگر [illegible] ایک ہی شعر کو کافی سمجھتے ہیں تو وہ مجھے [illegible] کے شعر کو سامنے رکھ [illegible] انکی شاعری کا کلی رجحان مزاج کردار پر انہی کی عبارت میں اپنے خیالات سمیٹ

اظہار کریں، جو عمارت انہوں نے خدا کیلئے قائم کی ہے۔

اقبالؔ :۔ جس کھیت کے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
— اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

عتیق اللہ :۔ میں کھڑا ہوں جائے نماز پر
— میرے سامنے سے گزر ذرا

رشید امکانؔ :۔ تم اپنا نام بھی جب آسمان رکھ لو گے
نظر اٹھانے نہ دے گا وہ سرفرازوں کو

عبدالحمید گوہر :۔ میری آنکھوں میں خون اترا تو
ایک بھی لوٹ کر نہ جائیگا

آخر میں سب سے زیر بحث شعر ہے۔

رستے میں وہ ملا تھا میں بچکر گزر گیا
اسکی پھٹی قمیض میرے ساتھ ہو گئی

ندا فاضلی کا یہ شعر واقعاتی شعر ہے جس میں شاعر نے اسنار[illegible] کی ناخاندانی بوباس اخلاق کی اعلیٰ قدریں، ہمدردی، حالات کی تیز رفتاری کی [illegible] اشارہ کیا ہے پھٹی قمیض شعر میں اشارہ کا رول ادا کر رہا ہے۔

رضا کی اپنی ذاتی کسوٹی کی پشت سے شعر کی [illegible] یوں سامنے آتی ہے کہ شاعر کا دوست خاندانی، انا پرست، ہمدرد اور آسودہ ہے اپنی آسودگی کے زمانے میں وہ اپنی بساط بھر ضرورت من[illegible] کی ضرورتیں پورا کرتا رہا، مگر وقت کے ساتھ اسکے حالات تبدیل ہو گئے اور وہ آج اس مقام پر پہنچ گیا کہ اس کے جسم پر ٹھیک طرح سے لباس بھی نہیں ہے۔ شاعر نے اپنے اس دوست کی کئی بار مدد کرنا چاہی مگر چونکہ [illegible] دوست خاندانی اور انا پرست طبیعت کا تھا

اسلیے اس کی غیرت نے کسی بھی طرح کی مدد قبول نہیں کی اور اپنے خاندان کی اعلیٰ روایتوں کا سر خم نہیں ہونے دیا۔ مگر انسانی فطرت کے مطابق شرم کی وجہ سے اس کی نظریں اُس وقت ضرور جھک جائیں جب اسکا کوئی دوست اُسکے سامنے سے گزرتا ہوتا۔

ایک روز شاعر کو اُس کا وہی دوست راستے میں دکھائی دیا شاعر اُسکے بیچ کر گزر گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میں اس سے نظریں ملاؤنگا یا بات کروں گا تو وہ شرمندہ ہو جائے گا۔

لہٰذا شاعر نے اپنے اخلاق کی اعلیٰ قدروں کا ثبوت دیا اور اُس سے بچکر گزر گیا وہ اس نظریں ملاکر اُسے اور شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر راستے بھر شاعر نے اسکے بارے میں سوچا رہا۔ یعنی پھٹی قمیض مفلوک الحالی کا نقشہ ہمدردی کی وجہ سے اس کے ذہن میں گھومتا رہا۔
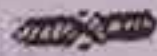
◐ برائے اشاعت "انتساب" سرونج ◐

دوہے لِدَا فاضلی

میں رویا پردیس میں بھیگا ماں کا پیار
دُکھ سے دُکھ نے بات کی بن چٹھی بن تار

اچھی سنگت بیٹھکر سنگی بدلے روپ
جیسے ملکر آم سے میٹھی ہو گئی دھوپ

وہ صوفی کا قول ہو یا پنڈت کا گیان
جتنی بیتے آپ پر اتنا ہی سچ مان

ننھیں چڑیاں دھوپ کی دور گگن سے آئیں
ہر آنگن مہمان سی پکڑو تو اُڑ جائیں

ساتوں دن بھگوان کے کیا منگل کیا پیر
جس دن سوئے دیر تک بھوکا رہے فقیر

یگ یگ سے ہر باغ کا یہ ہی ایک اُصول
جس کو ہنسنا آگیا وہ ہی مٹی پھول۔

سب کی پوجا ایک سی الگ الگ ہر ریت
مسجد جائے مولوی کوئل گائے گیت

[illegible]

انتساب کے آئندہ شمارہ میں

تبصرے ملاحظہ فرمائیے

ساحل احمد	موسم - ریزہ گل
عنوان چشتی	الہر احسن اور ان کی اصلاحیں
عبدالاحد ساز	خموشی بول اٹھی ہے
احمد کمال پروازی	مختلف
گوہر شیخ پوری	غبارِ فکر
نادیہ انجم	اردو شاعری میں عورت کا تصور
احتشام اختر	صبح کا ستارہ
فرید پربتی	آبِ نیساں
عروج زیدی	لہو کے چراغ مرتب عرفان زیدی
ندرت رتلامی	لطیف ندائیں
صبا بلگرامی	آہٹیں - دیوناگری
شاہد ساگری	صدیوں کا کرب

ڈاکٹر محمد حسن

محبی تسلیم۔ خط ملا شکریہ

میری مصروفیت کی نوعیت کچھ ایسی ہے
کہ کافی عرصہ تک تنقیدی مضمون لکھنے کی
نوبت نہیں آئے گی۔ اس لئے ندا اور انکی
شاعری پر شیفتہ ہونے کے باوجود ان
پر کچھ لکھ نہ سکوں گا

خیر طلب محمد حسن

برادرم سیفی صاحب

آپ خط ملا۔ یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ
آپ عنقریب انتساب کا ایک خصوصی شمارہ ندا
فاضلی کے نام نکال رہے ہیں۔ ندا فاضلی جہاں
ایک اچھے شاعر ہیں وہاں ایک بہترین فلمی گیت نگار
بھی ہیں انہوں نے دیگر فلمی گیت کاروں کی
طرح اپنے مزاج کو نہیں بدلا وہ اپنے معیار کو برقرار
کر رکھا ہے۔ مجھے بھی اپنی ایک فلم میں ان سے
گیت لکھانے کا شرف حاصل ہو چکا ہے
بحیثیت شاعر تو وہ ایک اچھے شاعر ہیں مگر بحیثیت
انسان بھی ایک اچھے انسان ہیں۔ ہاں یہ الگ
بات ہے کہ جن سے ان کا مزاج نہیں ملتا وہ
انہیں زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرسکتے

تیج ناتھ زار فلم ساز بمبئی

برادرم سیفی صاحب

علالت کی وجہ سے بھوپال ہوں اس لیے
ندا شاعر کے لیے کچھ نہ لکھنے سے معذور ہوں بہرحال
یہ خط آپ کے خط کے جواب میں تحریر کر رہا ہوں
ندا فاضلی صاحب کو میں اس وقت سے بہت
اچھی طرح سے جانتا ہوں اور مزید جاننے کے لئے
کوشش بھی کرتا رہتا ہوں۔ جب سے میں نے
ان کا یہ شعر سنا ہے

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی پہ پردے کھینچ دیے رات ہوگئی

جو خاص طور پر بحث و مباحثہ کا ذریعہ بنا رہا بہرحال
جو کچھ بھی ہو۔ میں نے موصوف کی کتاب مور ناچ
دیکھی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ندا صاحب اردو
کے ایسے شاعر ہیں جو اپنی شاعری میں ہندی کے
الفاظ خوبصورتی سے استعمال کرنا زیادہ پسند
کرتے ہیں۔ بہرحال یہ پسند بھی اپنے ذوق کی بات ہے
ورنہ گگتی دنیا کا لفظ جو ان کی نظم میں موجود ہے یہ ہندی کا

بقیہ صہ ۱۹۲

مائی ڈیر سیفی

انتساب کی کمیوں کے باوجود قابل توجہ ہے
غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ انتساب کو اچھے
لوگوں کا تعارف حاصل ہے تمہاری اس
جدوجہد میں جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا میں تمہارے
ساتھ ہوں انتساب کو کسی اعتبار سے سنوارنے
کی ضرورت ہے میں نے اپنا شعری سفر نظم
اور غزل سے آغاز کیا تھا۔ انہیں میں سے چند
معرا نظمیں انتساب کے لیے بھیج رہا ہوں

تمہارا اپنا امیر قزلباش

محترم سیفی سرونجی صاحب! تسلیمات

خدا کرے بہ خیر ہوں

آپ کا خط ملا جس سے ندا فاضلی نمبر کا علم
ہوا۔ واقعی آپ بہت ہی مستحسن اقدام کر رہے ہیں
ندا فاضلی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس نے
مردہ ہوتی ہوئی نظموں کے جسم میں نئی روح
اور توانائی بخشی ہے۔ آج کے دور میں جہاں شاعرے
ہی ادب کی پہچان اور اس کے فروغ و ترقی
کے راستے متعین کرنے میں معاون ہو رہے ہیں
اور جہاں غزلوں کے آنچل لہرائے جا رہے ہیں
انہیں کے حسن کا چرچہ ہو رہا ہے ندا فاضلی نے
نظموں، جدید نظموں اور یہاں تک کہ آزاد
اور معرا نظموں پر کام کر کے احسان کیا ہے ہم
جیسوں پر جو نظموں کی تخلیقیت پر کوشاں ہیں
احسان کیا ہے اردو ادب کی کمزور ہوتی ہوئی
صنف نظم پر۔

ندا فاضلی کی نظموں میں فنی پختگی کے ساتھ
روانی، حسن اور جاذبیت کا بھی کہیں فقدان نظر
نہیں آتا۔ جذبات نگاری اور برانگیختہ کر دینے والی
قوت تو شاید انہیں کے حصے میں پوری پوری آئی ہے
آزاد نظموں میں انہوں نے بے تحاشہ تجربے بھی
کیے ہیں۔ اور ان بجا تجربوں سے اردو ادب
کی یہ صنف بڑی حد تک متاثر ہوئی ہے بلکہ بہتوں
کو تجربے کرنے کی ہمت ہوئی ہے۔۔ حالانکہ ندا
فاضلی نے غزلیں بھی کم نہیں تخلیق کی ہیں اور وہ
کسی کم درجے کی حامل نہیں ہیں لیکن نظموں کے
تعلق سے ان کی تخلیقیت اور تجربوں سے ان کی

پہچان مکمل ہوئی ہے۔

خدا کرے کہ وہ فلموں کی دنیا میں رہ کر بھی ادب کی خدمت انجام دیں۔ فلموں سے اُن کی ذاتی زندگی کی بقا جڑی ہے بہر طور کوئی بھی زندگی سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اردو ادب کو ندا فاضلی کی ضرورت ہے

ظفر امام

محترم سیفی صاحب

السلام علیکم

انتساب آپ کی ادارت میں ایک زمانے سے نکل رہا ہے اور افسوس کہ اس کا ایک شمارہ بھی نظر سے نہیں گزرا۔ ان دنوں مختلف اخبارات و رسائل میں (پندار سے لے کر کتاب نما تک) انتساب کا اشتہار نظر سے گزرا۔ ندا فاضلی ہی واقعی اس قدر ٹھوس شناخت رکھتے ہیں کہ ان پر نمبر بھی نکالا جا سکتا ہے۔ فن کار کی قدر اس کی زندگی ہی میں ہونی چاہیے۔ مردہ پرستی بہت ہو چکی

ایک غزل اور نظم بھیج رہا ہوں امید کہ پسند آئیگی شریکِ اشاعت فرما کر ممنون ہونے کا موقع دیجیے گا۔

کاوش خیر

مکرمی۔ تسلیمات

گرامی نامہ نظر نواز ہوا۔ یاد آوری کیلئے شکریہ یہ جانکر خوشی ہوئی کہ آپ ندا فاضلی نمبر کی ترتیب تدوین میں مصروف ہیں۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے گا۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں بھی موصوف پر ایک قلم برداشتہ مضمون ارسال کردوں۔ جواب کا منتظر حکم کا منتظر رہوں گا

میرے دوسرے شعری مجموعہ پر آپ تبصرہ ضرور کیجئے مکمل کر کیجھے۔ تبصرہ انتظار رہے گا جلد ہی میری ایک اور کتاب مطالعۂ سودا منظر عام پر آنے والی ہے۔ آپ تک ضرور پہنچ جائے گی انتساب کے باقی شمارہ سے بھی نواز دیے گا مضمون آئے گا۔

آپ کا **فرید پروتی**

بقیہ
حیثیت کو قائم کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اور ان کی شاعری اور ادبی خدمات کو دستاویزی روپ کی شکل پیش کیا ہے

سعید محمد ایڈوکیٹ مسرفنج

بقیہ

لفظ بہت سے لوگوں کو اکھرتا ہے اور کھردرا
بھی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ندا فاضلی صاحب
غزل کے ہی الفاظ میں غزل کہتے ہیں تو وہ
غزلیں دیکھکر تو یقیناً ان کا شمار صفِ اول کے شاعروں
میں کرتا ہوں۔

یوں تو انتساب کا مطالعہ پابندی سے
کرتا رہا ہوں۔ لیکن تازہ شمارے میں وقار خاطمی
صاحب کی غزلیں دیکھکر اس بیماری کی حالت
میں بھی چیخ اٹھا

اتنی اچھی غزلوں پر میری طرف سے
انہیں مبارکباد بھیج دیجئے۔

اسماعیل ذبیح

نئے زاویے

ڈاکٹر رفعت اختر کی ایک تنقیدی کتاب
کے
تنقیدی مضامین کا مجموعہ

سکین بک ڈپو دونی ڈنگری روڈ ڈہیپور

سیفی صاحب۔ ندا فاضلی نمبر کی اشاعت
اور اس میں اعلیٰ ادب اور نقادوں کی شرکت
آپ کے جہد کی مثالی کوشش کہی جا سکتی ہے
اور ادب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ندا
فاضلی صاحب کی شخصیت ان کی ادبی خدمات
کے متعلق ایک دعوت عام کی شکل میں انتساب کا
نمبر وجود میں آرہا ہے۔ جس سے ہندوستان کی
ایک اہم شخصیت اردو ادب کی ہمہ رنگ صلاحیتیں
قوس و قزح کی طرح اردو ادب کے افق پر رونما
ہونگی۔ ندا فاضلی کا تخیل مستقبل کی نمائندگی کرتا ہے
وہ ہمیشہ حال کے آئینے میں مستقبل کا چہرہ دیکھتے ہیں
ان کی شاعری خاص طور پر ان کے دوہے اردو
ادب میں ملک کے ان عوام کے جذبات کی
ترجمانی کرتے ہیں جو اکثریت سے متعلق ہیں ان کی
شاعری تخصیص سے مبرا ہو کر سارے عوام کیلئے
ہے۔

میں سیفی صاحب کو اس ادبی کوشش کی
داد دیتا ہوں کہ انہوں نے ندا فاضلی نمبر نکال کر
ملک کے ادیبوں اور نقادوں میں ندا فاضلی کی

۔ بقیہ صفحہ ۱۹۱ پر ۔

عزیزی سیفی

تم واقعی تعریف کے مستحق ہو۔ تمہاری مسلسل کوشش غور طلب ہے تم اس انتشار و انحطاط کے دور میں قلم تھامے ہوئے اپنی منزل کی طرف کامیابی کے ساتھ گامزن ہو۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ میں اپنے آپ میں کتنا محتاط ہوں لیکن آج اردو کے لئے تمہاری خدمت لگن اور مسلسل کوشش نے مجھے یہ کہنے پر مجبور کردیا ہے۔ مجھ جیسے لوگوں کی باتوں سے مایوس نہ ہوں۔ جن کا مسلک کچھ نہ کرنا اور بہت کچھ کہنا ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ نوجوانوں کو آگے بڑھا کر اور بزرگوں کی سرپرستی حاصل کرکے انتساب دن بدن قدم بقدم آگے بڑھتا رہے گا۔ سید صاحب شمسی کا خط سیفی کے نام نے بہت متاثر کیا غالب کے گم شدہ خط کو پڑھنے کا موقع ملا شمسی صاحب کی خدمت میں صرف اتنا ہی عرض ہے۔ تمہاری تحریر اور اپنے حال پر رحم آیا۔

اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالے اردو کی خدمت کے لئے تمہارے ارادوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرے۔

رشید انصاری

پرنسپل حبیبیہ اسکول سرونج (ایم۔پی)

عزیزم سیفی سرونجی

سرونج سے اتنا اچھا ادبی جریدہ شائع کرنے پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔ ذرا کتابت کی طرف مزید توجہ فرمائیں ندا فاضلی نمبر آپ نکال رہے ہیں یہ جان کر خوشی ہوئی۔ اس طرح کے نمبر آنے چاہئیں خدا آپ کو اس پروجکٹ میں کامیابی عطا فرمائے

خلوص کیش حامد جعفری

برادرم سیفی صاحب سلام و خلوص

آپ کا پرچہ انتساب موصول ہوا۔ خوشی ہوئی کہ اس ماہ کا پرچہ کافی دیدہ زیب ہے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگلا شمارہ ندا فاضلی نمبر آرہا ہے انشاء اللہ وہ بھی شایان شان ہوگا۔ ندا فاضلی پر نمبر آپ کا ایک خوشگوار اقدام ہے اسکی پذیرائی ادبی حلقوں میں یقیناً ہوگی۔ امید مزاج بخیر ہوگا۔

خلوص کیش۔ رہبر جونپوری

برادرم سیفی صاحب

انتساب کا تازہ شمارہ موصول ہوا شکریہ
بدقسمتی سے یہ پرچہ اب تک میری نظر سے نہیں گزرا
تھا۔ آج اسے پڑھ کر، دیکھ کر آپ کی جانفشانی
اور اس کے وزن کا اندازہ ہوا۔ کوئی ضروری نہیں
کہ کسی پرچے پر سونے کا پانی چڑھا ہو یہ سب
کی ماری دنیا کے چوچلے ہیں۔ اصل چیز تو
پرچے کی معنوی حیثیت ہے۔ دو دلھن میں گُن
ہوں تو میلے لباس میں بھی خوبصورت لگتی ہے
مجھے حیرت ہے کہ محدود وسائل اور اپنے پرایوں
کی بے مہری کے باوجود آپ دس سالوں سے
اس پودے کو لہو پسینہ دے رہے ہیں۔ اسے
زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہ بڑی ہمت کا کام ہے
خوشی کی بات ہے کہ آپ کو اچھے لکھنے
والوں کا تعاون حاصل ہے ڈاکٹر تارا چرن
رستوگی کا مضمون اس شمارے کی جان ہے
دیگر مشمولات بھی خوب ہیں۔ بس اداریے کی
کمی محسوس ہو رہی ہے۔ آپ اداریے لکھا کیجئے
قلمی تعاون کے طور سے دو غزلیں بھیج رہا ہوں
پسند آئیں تو شائع فرمائیں
امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا فقط

خیر اندیش
ظفر گورکھپوری۔ بمبئی

جناب سیفی صاحب

آداب

مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ہے
کہ آپ انتساب کا ندا فاضلی نمبر نکالنے جا رہے
ہیں ندا صاحب اس زمانہ کے بہترین شاعروں
میں سے ہیں۔ ان کی شاعری اردو زبان کو
ایک نئی دین ہے وہ لکیر کے فقیر نہیں ہیں انہوں نے
سب سے ہٹ کر لکھا ہے۔ میں نے انہیں انگریزی
میں پڑھا ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں نئی نسل
پر ایک گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ میری طرف سے اس
نمبر کے لئے مبارکباد۔

دیو نرائن شرما
ایڈوکیٹ
سرونج ضلع ودیشہ ایم پی

ڈیر سیفی۔ سلام و محبت

تمہاری لگن اور محنت کا معترف شروع سے
رہا ہوں۔ یہی سبب ہے کہ حسب مقدور تمہاری
ہمت افزائی کرتا رہا۔ قانون قدرت ہے کہ
محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی یہ محنت "انتساب"
کی تحریروں میں صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ اب تم
اطمینان سے اس طرز میں نثر لکھ سکتے ہو۔ لفظ
اطمینان سے مطمئن نہ ہو جانا۔ مطمئن ہونا موت
کی علامت ہے۔ ہر تحریر میں بہتر بنائے جانے کے
امکانات ہمیشہ رہتے ہیں۔ کوئی نثر کلی طور پر مکمل
نہیں ہوتی۔ نثر اور شاعری میں بہت بڑا فرق ہے
شعر میں شاعر جو کچھ کہتا ہے ضروری نہیں کہ قاری
وہی سمجھے۔ شعر میں پس الفاظ بھی بہت کچھ ہوتا ہے جو
قاری اپنی سمجھ میں دیکھتا ہے یا محسوس کرتا ہے نثر کے
ساتھ ایسا نہیں۔ لکھنے والا جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہی قاری کو
بھی سمجھنا چاہیے اس لئے نثر میں الفاظ کا استعمال
اور جملے کی ساخت بہت احتیاط چاہتے ہیں شاعری میں
"وزن" کو چھوڑ کر تقریباً ہر غلطی کا جواز پیش کیا جا سکتا ہے
جبکہ نثر میں ایسا نہیں۔ اگر جملے کی ساخت اور الفاظ
ٹھیک نہوں تو مفہوم بدل سکتا ہے۔ مقصد فوت
ہو سکتا ہے۔ بہر حال تمہارا اداریہ دیکھ کر خوشی ہوئی
مواد کو اور اہمیت دو۔ مواد کی کمی ہونے پر متاثر
ہونا ممکن نہیں چاہے طرز تحریر کتنا اچھا کیوں نہ ہو
اور یہ کمی صرف زیادہ سے زیادہ مطالعہ کر کے ہی
دور کی جا سکتی ہے۔ انتساب آئندہ شمارہ بلا فانی
نمبر نکلے گا یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی۔ لیکن اس
شمارے پر ذرا محنت کر لینا خوبصورت شاعر پر خوبصورت
نمبر ہی آنا چاہیے۔

تمہارا وقار فاطمی

بنگلہ دیش کے مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار
شام بارکپوری کی تازہ پیش کش

ناولٹ **آتشی چنار**

منظر عام پر آ چکا ہے

قیمت ـــــ پچاس ٹکے (روپے)

ملنے کا پتہ :۔ شام بارکپوری پیچر پیلس کھلنا (بنگلہ دیش)

برادرم عزیز بیگی صاحب

سلام و رحمت

کل آپ کا کارڈ ملا۔ شکریہ۔ اس خبر سے خوشی ہوئی کہ آپ کا مقالہ تکمیل کے مرحلوں میں ہے

ندا فاضلی نے طویل عرصہ تک خاموشی کے ساتھ مختلف زبانوں خاص طور پر اردو شاعری اور انگریزی ادب کا سنجیدگی کے ساتھ گہرا مطالعہ کر کے اردو شاعری میں اپنی ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ انہوں نے اپنی اہمیت کو اور شاعرانہ حیثیت کو منوایا ہے (مانے نہیں گئے) تو درست ہوگا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ بھیڑ جیسی ادب کی منڈی میں جن ندا اور لوگوں کی ساکھ جمی ہوئی تھی وہ آسانی کے ساتھ کسی کو اپنے صفوں میں گھسنے نہیں دیتے۔ ندا فاضلی نے اپنی ذہانت اور وسیع ترین مطالعہ کے زور پر سب سے پہلے ان کے خیموں کی طنابیں ڈھیلی کیں اور پھر ان کے شخصی گوشوں کی کمزوریوں پر ضرب لگائی پھر ان کی صفوں میں پہنچ کر اپنا ندا ادبجا کیا۔ ندا کی شخصیت کو نمایاں کرنے سنوارنے اور بنانے میں صرف اس کے شعور، صلاحیت اور قابلیت کو دخل ہے۔ ندا کی شاعری کا بڑا حصہ ہندوستانی تہذیب، تمدن، یہاں کی اساطیر، قدیم ملی جلی روایت کی انفرادی انداز میں ترجمانی کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ تخلیقی یا تخیلی سطح پر تقلید سے شعوری طور پر گریز کرتے ہیں اگرچہ ان کی رومانی شاعری کلاسیکیت سے بہت قریب ہو کر گزری ہے لیکن انہوں نے جن علامتوں اور لفظیات کو اظہارات کے لئے انتخاب کیا ہے وہ ندا فاضلی کی پہچان کہی جا سکتی ہے

عشرت قادری

بڑی زبان کا زندہ رسالہ
ادب آرٹس کلچر کا ترجمان
سہ ماہی
ذہنِ جدید
ترتیب زبیر رضوی

کلام سے روشناس کرانے کے لئے جدوجہد
قابل تحسین ہے میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیں

مخلص سید ضیاء الدین نوشاد
ایم۔اے۔بی۔ٹی سرونج

مکرمی سیفی صاحب زاد اللہ تعالیٰ در جاتکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
یہ سن کر قلبی مسرت ہوئی ماہنامہ انتساب
اپنی زندگی کے دس سال پورے کرتے ہوئے
ملک کے ایک مشہور ادیب ندا فاضلی پر ایک نمبر
نکال رہا ہے صمیم قلب سے دعا گو ہوں اللہ پاک
آپ کو اردو ادب کی اس خدمت جلیلہ پر بہترین
بدلہ نصیب فرمائے۔ اور آپ کی کاوش ادب،
بشکل انتساب چار دانگ عالم میں مقبول ہو
میری دلی تمنائیں اور نیک دعائیں آپ کے ساتھ ہیں
آپ کا اپنا
ننگ اسلاف
غازی ولی احمد ولی چشتی

عزیز دوست سیفی۔ نیک تمنائیں
مدھیہ پردیش کی ایک چھوٹی سی تحصیل سرونج
جیسی جگہ جس کو یہاں کے بڑے شہروں جیسے
اندور، بھوپال، جبلپور، گوالیار، کھنڈوہ کے
بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

وہاں سے آپ مدھیہ پردیش کا اردو کا
واحد سہ ماہی انتساب ۱۹۷۲ء سے مسلسل
محدود ذرائع اور بیحد دشواریوں کے باوجود
جس عزم، جوانمردی اور مستعدی سے شائع
کرتے آئے ہیں اس کی جس قدر تعریف کیجائے
کم ہے

انتساب کا آئندہ شمارہ ندا فاضلی نمبر
ہوگا یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی
ندا صاحب نہ صرف انڈیا بلکہ ایشیا کی
سرحدوں کو عبور کر چکے ہیں ندا صاحب کی
اردو ادب میں اہم خدمات میں ایسی پرکشش
اور ہر دل عزیز شخصیت کا تعارف اور ان کے

برادرم۔ آداب

آپ کے خطوط مجھے برابر وصول ہوتے رہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ میرے دو خطوط آپ تک نہیں پہنچے حیرت ہے۔ شاید محکمہ ڈاک کی نوازش نذر ہو گئے ہوں گے۔ اس کے باوجود آپ نے محبت سے مجھے یاد فرمایا۔ اس کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں۔

ندا صاحب پر میں ضرور لکھوں گا مگر یہ دو سو والی قید ہٹا لیں اگر آپ کہیں گے تو اس میں دو سو پر بھی اظہار خیال ممکن ہے مگر ندا صاحب پر اس کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا جانا چاہیے۔ بہر حال یہ کام آپ کا خط آنے پر شروع کروں گا۔ ندا صاحب کی شاعری مجھے پسند بھی ہے اور میں ایک لمبے عرصے سے ان پر لکھنا بھی چاہتا ہوں۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں

مخلص ش۔ ک۔ نظام

محترم سیفی سرونجی صاحب

السلام علیکم

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ پچھلے دس سالوں سے تواتر کے ساتھ یہ رسالہ شائع کر رہے ہیں اور اب بہت جلد دو سو صفحات پر مشتمل ندا فاضلی نمبر بھی پیش کرنے والے ہیں اللہ آپ کی مشکلوں کو آسان کرے اور ارادے کو تکمیل تک پہنچائے

ندا صاحب ایک اچھے شاعر ہیں اور بڑی خوبصورت شاعری کرتے ہیں لیکن اب شاعر ہیں "دیواروں کے بیچ" کی اقساط کو پڑھ کر ان کی نثری صلاحیت کا بھی معترف ہو گیا

مخلص قیصر اقبال مونگیر (بہار)

رائل ٹیلرز
سرونج ہاسپٹل کے سامنے
بہترین سفاری سوٹ اور ہر طرح کے بیگی پینٹ کی سلائی کا مرکز
پروپرائٹر۔ ریاض احمد خاں

جانسن ٹیلرز:- پینٹ، شرٹ، سفاری سوٹ، اسپیشلسٹ
پروپرائٹر عزیز قرار قریشی۔ ڈھال بازار سرونج

پیارے بھائی سیفی آداب

انتساب کا یہ شمارہ آپ ہندوستان

کے مشہور شاعر و ادیب "ندا فاضلی" پر نکال

رہے ہیں مبارکباد

ندا فاضلی ہندوستان کے ادبی

اسٹیج پر دھوم مچا رہے ہیں ان کی شاعری

ہماری دھڑکنوں سے سیدھا ساکشاتکار

کرتی ہے۔ سرونج جیسے دور دراز کے علاقے

سے انتساب کی کئی سالوں سے لگاتار اشاعت

اور اس پر ندا فاضلی پر خاص نمبر یقیناً ایک

کارنامہ ہے۔

میں انتساب گروپ کو اور اتنی اچھی

اشاعت کے لئے آپ کو دل سے مبارکباد دیتا ہوں

ڈاکٹر راجیش شری واستو

اسسٹنٹ پروفیسر ہندی

گورنمنٹ کالج سرونج

برادرم۔ آداب۔ خط ملا شکریہ

ندا کے بارے میں تفصیلی مضمون لکھنا تو فی الحال ممکن نہیں

لیکن جلد ہی چند سطریں لکھ بھیجوں گا۔ ندا میرے پسندیدہ شاعروں

میں سے ایک ہیں۔ مجھے ندا اور ان کی شاعری عزیز ہے

دلی آئیے تو ضرور ملئے۔ کمار پاشی

TOMAR IRON INDUSTRIES

SHAKTI THRASHER.

—"— —"- TROLLY.

—"— —"- SEED DRYL,

—"— —"- CULTIVATER,

—"— —"- PLAOUGH.

PRODUCTIONER OF BEST QUALITY

UDHYAI BHAN SINGH TOMAR

Link Road

SIRONJ. M.P.

برادرم سیفی صاحب

آداب و نیاز

انتساب سہ ماہی باصرہ نواز ہوا بہت
ممنون ہوں۔

جہاں "شاعر" اور "کتاب نما" جیسے ماہنامے
حالات کی سنگلاخ فصیلوں پر مسلسل کمندیں
پھینک رہے ہیں وہیں سہ ماہی نوازش اور
"انتساب" "صف شکنی کا بہترین نمونہ پیش کر رہے ہیں
اس کی تمام تر کریڈٹ آپ حضرات کی مدیرانہ
صلاحیتوں کو جاتی ہیں۔ پابندی سے پرچہ نکالنے
عمل صوفیانہ ضبط اور درویشانہ تحمل کا متقاضی ہے
اور اس پر ستم یہ کہ فنکارانہ سیمابیت۔ بھئی
میں تو حیران ہوں اس دوہرے منظرنامے
کو دیکھ کر۔ آپ نے جس قدر جلد بصیرت اور
اعتبار کا سفر طے کیا ہے اتنا شاید کسی اور نے
نہیں کیا میرے اس ایقان اور اعتراف کا جواز
یہ ہے کہ شمارے میں ملک کے تمام باوقار و معتبر
ادیب جیسے جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر اختر نظمی، ڈاکٹر
عزیز اندوری، احتشام اختر، ساحل احمد، شجاع خاور
رؤف جاوید، اور ڈاکٹر کشور سلطان وغیرہ ایک
ساتھ شامل ہیں۔ میری جانب سے آپ اور تمام
معاونین حضرات مبارکباد قبول فرمائیں یہ جان کر
خوشی ہوئی کہ آپ ندا فاضلی پر گوشہ نکال رہے ہیں
اگر دو ایک ماہ کی مہلت مل جاتی تو میں بھی اس
البیلے شاعر پر کچھ لکھتا۔ بہرحال میری طرف سے
مبارکباد قبول فرمائیں

احمد کمال پروازی

سیفی سرونجی کی کتابیں

(۱) روشن الاؤ — شعری مجموعہ

(۲) رنگ اور خوشبو — دیوناگری

(۳) ہم رہ گئے اکیلے — افسانے

(۴) ایک لمحہ ایک خواب — شعری مجموعہ

(۵) رنگوں کا امتزاج — مضامین

ملنے کے پتے

(۱) مکتبہ جامعہ دہلی۔ بمبئی

(۲) سیفی لائبریری سرونج ایم پی

سرونج

ERNARAYAN
Advocate'
SIRONJ

ARUN KUMAR GARG
Social Worker
SIRONJ

Dr. RAJESH
A.Pro.
L.B.S.College SRJ.

MOHD. NAS
Joint Secre
M.P.Yout
Congress

ندا فاضلی نمبر کی اشاعت

WITH ALL COMPLIMENTS

CONGRATULATE

پر

MAKANT TARAN
Secretory
mist & Drugist
sociation SIRJ.

HASEEN SHER
'Thekedar'S

ہم سب کی طرف سے

FOR NIDAFAZALI'S

دلی مبارکباد

SPECIAL ISSUE

وقار

ڈاکٹر

سرونج
الدین نوشاد
سرونج

موسیقی حسن تہذیب اور محبتوں کے

لازوال لمحات کی داستان

محبتوں کا سفر

ایک فلم جو روایت بھی ہے اور جدت بھی

موسیقی بھی ہے اور عشق کی ابدی داستان بھی

جس کا افسانہ، جس کے نغمات اور جس کی

ہدایت کاری

صلاح الدین پرویز

کا کارنامہ ہے

اور جس کی موسیقی کو خیّام نے عشق کی راگنی بنایا ہے

السلام انٹرنیشنل کی نئی فلم جو فلم سازی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے والی ہے

۹/بی سی - این سی اپارٹمنٹس، پکنک کاٹیج ورسوا روڈ بمبئی ۶

فون نمبر: ۶۲۶۹۹۲۵ • ۶۲۰۹۷۳۳